ماہنامہ

حکمت بالغہ

دسمبر 2010

مدیر: انجینئر مختار حسین فاروقی

قرآن اکیڈمی

جھنگ پاکستان

فون اور فیکس:-0092-47-77628261

ای میل:hikmabaalgha@yahoo.com

ویب سائٹ: http://hamditabligh.net

قرآن مجید

کے ساتھ

چند لمحات

سورۃ الرحمٰن (آیات 1۔21)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلرَّحْمٰنُ O (وہ سب سے زیادہ اور) بہت زیادہ رحم کرنے والا (ہے)

عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ O (اس کی شانِ رحیمی کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ) اس نے قرآن (پاک نازل فرمایا اور اس) کی تعلیم دی

خَلَقَ الْاِنْسَانَ O اس (الرحمٰن) نے انسان کو (احسن تقویم پر) پیدا فرمایا

عَلَّمَہُ الْبَیَانَ O اس (انسان) کو بیان (کرنے کی قوت وصلاحیت بھی بخشی اور اس) کی تعلیم دی

اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ O (اسی نے انسان کی خدمت رسانی کے لئے) سورج اور چاند ایک شاندار انداز سے بنائے

وَّ النَّجْمُ وَ الشَّجَرُ یَسْجُدٰنِ O اور (ہر قسم کی) جھاڑیاں اور (تمام) درخت سجدہ ریز ہیں

وَ السَّمَآءَ رَفَعَھَا اور آسمان کو (بھی پیدا کر کے) بلند کر دیا

وَ وَضَعَ الْمِیْزَانَ O اور (اس سلسلۂ کائنات میں) ایک حسین توازن (اور ہم آہنگی) پیدا فرمائی

اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ O (اور انسان کو حکم دیا کہ اس سلسلۂ کائنات میں اپنی اعلیٰ حیثیت اور اختیار کی قدرت کی بنا پر آفاقی سطح پر جاری) اس (باہمی) توازن کو غارت مت کرنا

وَ اَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ O اور (اس کائناتی) توازن کو انصاف کے ساتھ (ٹھیک ٹھیک) قائم رکھو (یا قائم کرو) اور (انسانی سطح پر) میزان (ناپ تول وغیرہ کے پیمانے) کو گھٹاؤ مت۔

وَ الْاَرْضَ وَضَعَھَا لِلْاَنَامِ O اور اس نے زمین (کی ساخت) کو جانداروں کے لئے

موزوں بنایا ہے۔

فِیۡهَا فَاکِهَةٌ وَّ النَّخۡلُ ذَاتُ الۡاَکۡمَامِ ۝ اس (زمین) میں میوے (پھل) اور کھجوریں جن کے۔

وَ الۡحَبُّ ذُوالۡعَصۡفِ وَالرَّیۡحَانُ ۝ اور (اناج کے) دانے چھلکے والے اور خوشبودار پھول۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝ تو (اے جنو! اور انسانو!) تم اپنے رب کی بے شمار قدرتوں (اور نعمتوں) میں سے کس کس کی تکذیب کرو گے۔

خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ کَالۡفَخَّارِ ۝ اس (اللہ) نے (اس زمین پر) انسان کو کھنکھناتے گارے سے پیدا کیا۔

وَ خَلَقَ الۡجَآنَّ مِنۡ مَّارِجٍ مِّنۡ نَّارٍ ۝ اور اس (اللہ تعالیٰ) نے جنوں کو (پہلے) آگ کی لپک سے پیدا فرمایا۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝ تو (اے جنو! اور انسانو!) تم اپنے رب کی بے شمار قدرتوں (اور نعمتوں) میں سے کس کس کی تکذیب کرو گے۔

رَبُّ الۡمَشۡرِقَیۡنِ وَ رَبُّ الۡمَغۡرِبَیۡنِ ۝ (اور وہ) مالک ہے (سردیوں میں اور گرمیوں میں) سورج کے نکلنے کی دو جگہوں اور غروب ہونے کی دو جگہوں کا (بھی)۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝ تو (اے جنو! اور انسانو!) تم اپنے رب کی بے شمار قدرتوں (اور نعمتوں) میں سے کس کس کی تکذیب کرو گے۔

مَرَجَ الۡبَحۡرَیۡنِ یَلۡتَقِیٰنِ ۝ بَیۡنَهُمَا بَرۡزَخٌ لَّا یَبۡغِیٰنِ ۝ اسی (مالک) نے چلائے دو دریا قریب قریب ملے ہوئے جن کے درمیان (ایک) آڑ (بنا دی) ہے کہ دونوں آپس میں گڈمڈ نہیں ہوتے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝ تو (اے جنو! اور انسانو!) تم اپنے رب کی بے شمار قدرتوں (اور نعمتوں) میں سے کس کس کی تکذیب کرو گے۔

یَخۡرُجُ مِنۡهُمَا اللُّؤۡلُؤُ وَ الۡمَرۡجَانُ ۝ انہیں (دریاؤں) سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝ تو (اے جنو! اور انسانو!) تم اپنے رب کی بے شمار قدرتوں (اور نعمتوں) میں سے کس کس کی تکذیب کرو گے۔

وَ لَـهُ الْـجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِی الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ O اور اُسی (اللہ تعالیٰ جس نے انسان کو قرآن مجید سکھایا) کے ہیں پہاڑوں جیسے جہاز سمندر میں رکے ہوئے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ O تو (اے جنو! اور انسانو!) تم اپنے رب کی بے شمار قدرتوں (اور نعمتوں) میں سے کس کس کی تکذیب کرو گے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ O ہر (جاندار) جو اس زمین پر ہے وہ فنا ہونے والا ہے۔

وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ O اور باقی رہے گا صرف تیرے رب کا اقتدار جو جلال اور بزرگی والا ہے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ O تو (اے جنو! اور انسانو!) تم اپنے مالک (جس نے تمہیں پیدا کیا، زبان دی، قوتِ بیان دی، قرآن مجید اُتارا، اس کی تعلیم کے لئے حضرت محمد ﷺ جیسی عظیم ہستی بھیجی۔ اُنہوں نے ہمیں دامے درمے سخنے یہ قرآن سکھایا اور اُسوۂ حسنہ تمہارے لئے چھوڑا وہ مجسم قرآن تھے) کی ان قدرتوں (کرشموں، کمالات اور احسانوں) میں سے کس کس کا انکار کرو گے (اور عدم توجہی کا شکار ہو گے)۔

صدق اللہ العظیم

کائنات کی اس رنگا رنگی کا مطالعہ ہی تمام انسانی علوم کا حاصل ہے اور ان علوم میں اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اقرار، قرآن مجید کا ماننا اور قرآن لانے والے حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں آگے بڑھنے کا کام ہی نظریاتی تعلیم ہے اور پاکستان کے مطلب ''لا الٰہ الا اللہ'' کی واحد ممکن تشریح ہے۔ اسی کا ادراک نظریۂ پاکستان ہے اور اسی کے عملی طور پر نفاذ کے تقاضے پورے کر کے پاکستان کو آج کے دور میں جدید اسلامی جمہوری مثالی فلاحی ریاست میں بدل دینا ہماری دینی ذمہ داری، اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ سے وفاداری کا تقاضا اور مبشر پاکستان علامہ اقبال اور بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی خدمات کا اعتراف بھی ہے۔

حرفِ آرزو

انجینئر مختار فاروقی

الحمدللہ ــــــــــــ 'حکمت بالغہ' جھنگ اپنی مختصر چار سالہ صحافتی زندگی میں چوتھی خصوصی اشاعت بعنوان ''دوقومی نظریہ ــــ اور پاکستان کا نظریاتی نظامِ تعلیم؟'' اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔ ہماری یہ آرزو ہے کہ مسلمانوں میں بالعموم اور مسلمانانِ پاکستان میں بالخصوص قرآن مجید کا پڑھنا پڑھانا، سیکھنا سکھانا عام ہو لوگ اس کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔ اہل علم اور دانشور حضرات اس کے مضامین میں غور کریں اس کے عجائبات کو آشکارا کریں اور اس قرآن مجید کی تعلیمات کو مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جو اہمیت دی جانی چاہیے وہ اہمیت دلانے کے لیے معاشرہ میں جدوجہد کریں اور لوگوں میں اس کا شعور پیدا کریں۔

'حکمت بالغہ' قرآن مجید کی نسبت سے ایک مسلمان کی ذمہ داریوں کے شعور اجاگر کرنے کے لیے کوشاں ہے اور اپنی بے بضاعتی اور وسائل کی کمی کے باوجود مقدور بھر سعی کر رہا ہے کہ جہاں تک ہو سکے اپنا فرض ادا کیا جائے اور اس کام میں اپنا حصہ ڈالا جائے۔

اب تک جو خصوصی اشاعتیں پیش کی گئی ہیں وہ اسی سلسلے کی خصوصی کاوشیں ہیں۔ یوں تو حکمت بالغہ کا ہر مضمون اپنے مشن ہی کی سمت میں ایک چھوٹے سے قدم کی حیثیت رکھتا ہے تاہم یہ خصوصی اشاعتیں یا 'خصوصی نمبر' کچھ عرصے بعد اپنے پیغام کو یکجا کر کے قارئین کے سامنے بار بار پیش کرنے کا اہتمام ہے تاکہ ہم وقت گزرنے کے ساتھ اپنے مشن سے غافل نہ ہو جائیں۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور ہم انسانوں کی رہنمائی کے لیے اتارا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے یہ مبارک کلام اپنے خاص بندے حضرت محمد ﷺ کو عطا فرمایا تھا تا کہ اس کو خلق خدا تک پہنچایا جائے آپ ﷺ نے اس کی سعی مشکور فرمائی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک کثیر جماعت تک اس کے پہنچانے کا دامے درمے سخنے (یعنی قول وفعل وعمل سے) حق ادا کر دیا۔ پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسی کو حرز جان بنایا، عمل کا نمونہ بنے، انفرادی و اجتماعی زندگی میں اس پر کماحقہٗ عمل بھی کیا اور خلافت راشدہ قائم کر دی جہاں اس قرآن مجید پر حضرت محمد ﷺ کے بتائے طریقے کے مطابق زندگی کے تمام شعبوں میں عمل ہوتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ جذبے میں کمی آتی چلی گئی، کئی عروج و زوال اور نشیب و فراز آئے اور آج ہم مسلمان دنیا میں موجود ہیں اور ہمیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلانے والی یہ ابدی کتاب بھی موجود ہے اور آپ ﷺ کی احادیث مبارکہ بھی موجود ہیں تا کہ ہم اس سے رہنمائی حاصل کریں اور اس پر عمل کر سکیں۔

مگر ہمیں ــــــــــــ قرآن مجید سے وہ دلچسپی اور شوق نہیں جو مطلوب ہے کیوں ــــ؟ وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید انسانوں کے لیے آیا ہے لیکن انسان کون ہے؟ اس کی وضاحت خود قرآن پاک نے کی ہے کہ انسانی چہرے بشرے اور جسمانی ساخت والی تمام مخلوق انسان کہلانے کی مستحق نہیں ہے اسی لیے ان کو قرآن مجید سے دلچسپی نہیں۔ قرآن مجید فرماتا ہے کہ بہت سے لوگ بظاہر سماعت بصارت اور دل رکھتے ہیں مگر وہ انسان نہیں جانوروں کی سطح پر اتر گئے ہیں کہ وہ اپنی سماعت بصارت اور دلوں سے وہ کام نہیں لیتے جو انسان کو لینے چاہئیں، ان کے اندر کا حقیقی انسان مر چکا ہے..... جو 'روح' کہلاتی ہے۔ روحِ انسانی جان سے ایک مختلف شئے ہے اور حقیقتِ انسان ہے اسی روح کی وجہ سے انسان مسجودِ ملائک بنا ہے نہ کہ جسم کی وجہ سے۔ یہ تمام حقائق وضاحت کے ساتھ حکمت بالغہ کی پہلی خصوصی اشاعت دسمبر 07ء میں ''حقیقت انسان نمبر'' میں شامل کی گئی ہیں۔

پھر انسان کو چاہے وہ روح سے عاری ہو جائے جو صلاحیتیں اللہ تعالیٰ نے دی ہیں ان سے کام لے کر وہ علم حاصل کرتا ہے اور اس سے کائنات کو مسخر کرنے اور کام میں لانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے یہ تجرباتی علوم ہیں جن سے ساری سائنسی ترقی مستعار ہے۔ مگر یہی تجرباتی علوم

اور عمرانی علوم ہی 'کل' علم نہیں ہے' ایک دوسرا علم ہے جو اللہ تعالیٰ نے 'وحی' اور انبیاء کے ذریعے انسانوں تک پہنچایا، یہ 'روح' کی سطح پر علم ہے وجدانی علم ہے غیر تجرباتی ہے۔ اگر انسان کے اندر 'روح' مردہ ہو جائے ضمیر مردہ ہو جائے یا انسان کے اندر کا حقیقی انسان مر جائے تو انسان قرآن کو نہیں پہچان سکتا نہ 'نبوت' و رسالت پر ایمان لانے کی توفیق ملتی ہے۔ ابوجہل بظاہر انسان تھا مگر اس کے اندر کا انسان مر چکا تھا وہ قرآن مجید بطور 'وحی ربّانی' قبول نہیں کر سکا اور نہ آپ ﷺ پر ایمان لایا۔ تجرباتی علوم، علم وحی کے ساتھ مل کر ہی حقیقی علم بنتا ہے اور اس حقیقی روشنی میں ہی اس کائنات کی صحیح ترین تشریح کی جا سکتی ہے اور یہ بات پورے شرح و بسط کے ساتھ واضح کی گئی تھی 'حقیقت علم نمبر' میں جو اگست 08ء میں شائع ہوا تھا۔

آج کی عمومی گمراہی، دین سے دوری، وحی سے ناآشنائی، خدا ناشناسی کی وجہ یہ ہے کہ آج 'علم' صرف تجرباتی اور عمرانی علوم کا نام ہے جبکہ اس 'میان' سے جو تلوار نکال لی گئی ہے وہ ہے علمِ وحی۔ آج کا انسان تجرباتی علوم کو ہی علم سمجھتا ہے اور 'علم وحی' یا انبیاء کرام علیہم السلام کی لائی ہوئی ہدایت و رہنمائی کو نہ اہمیت دیتا ہے نہ اس کو اپنی ضرورت سمجھتا ہے۔

لہٰذا ــــــــــــ ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان کی حقیقت کو سمجھ کر 'روح' اور اس کے تقاضوں کو تسلیم کیا جائے، علم وحی کو مانا جائے اور آج کے بے کیف 'علم' کے ساتھ علوم وحی یا علوم انبیاء علیہم السلام ملا کر اس کو پڑھا جائے تو حقیقی علم منکشف ہوگا جو انسان کی جملہ جسمانی و روحانی ضرورتوں کو پورا کرے گا۔

یہ کام ــــــــــــ علوم انبیاء کا احیاء اور تجرباتی علوم کو ان کے تابع کرنے کا کام ہے جسے حکمت بالغہ کی تیسری خصوصی اشاعت (مئی 09ء) کو ''احیاء العلوم نمبر'' کا نام دیا گیا ہے تاکہ انسان کو حقیقی علم سے آشنا کرایا جا سکے اور ہماری جدید تعلیمی درسگاہوں سے حقیقی انسان تیار ہو کر معاشرے کا حصہ بن سکیں۔ آج کی جدید درسگاہیں 'انسانیت کے مقتل' ہیں یہ درسگاہیں روح انسانی اور ضمیر کو مردہ کرنے والے، خدا ناشناس بلکہ خدا بیزار علوم کا منبع ہیں۔ یہاں علم وحی اور علوم انبیاء کو شامل کر کے حقیقی علم سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے۔ احیاء العلوم کا یہ کام آج کے دور میں از حد ضروری ہے ورنہ کچھ عرصے میں ساری دنیا کے اکثر انسان بے روح اور سیکولر مزاج

ہو جائیں گے اور حقیقی انسان کے مرتبے سے گر کر..... 'کالانعام' کا روپ دھار لیں گے۔

پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے اور یہ ہندو کے مقابلے میں دوقومی نظریہ کی بنیاد پر 'اسلام' کا نعرہ لگا کر بنایا گیا تھا۔ نظریہ پاکستان سوائے اسلام یا قرآن مجید کے کچھ اور نہیں ہوسکتا۔ پاکستان کی نظریاتی اساس کو مضبوط کرنے، استحکام دینے اور اس کی بقا کے لیے اس ملک میں نظریاتی تعلیم از حد ضروری ہے وہ نظریاتی تعلیم اسلامی تعلیم یا اللہ، وحی، نبوت کے تصورات کو جدید نظام تعلیم میں اس کا مقام دلانے کا نام ہے ہمارے نظام تعلیم میں خدا کا تصور رچا بسا ہونا چاہیے تا کہ وحی و نبوت پر ایمان کا جذبہ پیدا ہو سکے سیکولر نظام تعلیم اور سیکولر نظریات ہمارے نظریاتی ملک کے لئے 'سم قاتل' ہیں اور ہلاکت خیزی کا باعث ہیں۔

چنانچہ ـــــــــــــ حکمت بالغہ کا موجودہ 'خصوصی نمبر' اسی عنوان پر ہے۔ دوقومی نظریہ ـــ اور پاکستان کا نظریاتی نظام تعلیم؟۔

نظریاتی تعلیم کی طرف علامہ اقبال نے بھرپور توجہ دی تھی اور ان کے کلام میں اس پر سیر حاصل مواد موجود ہے، علامہ اقبال کی فکر کے مشہور شارح ڈاکٹر رفیع الدین (متوفی 1969ء) جو اقبال اکیڈمی پاکستان کے پہلے ڈائریکٹر تھے انہوں نے بھی اس ضمن میں خوب کام کیا۔ تعلیم کے لیے ایک نظریہ اور صحیح نظریہ کی ضرورت پر زور دیا، FIRST PRINCIPLES OF EDUCATION کتاب لکھی۔

پھر پاکستان اگر نظریاتی ریاست بن جائے اور اس کا نظام تعلیم بھی نظریاتی ہو جائے تو یہاں سے جو لاکھوں نوجوان نکلیں گے وہ ملک کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کریں گے، منکرات و فواحش کا خاتمہ کر دیں گے اور حقیقی اسلامی ریاست قائم ہو جائے گی۔ پاکستان کے دورِ حاضر میں حقیقی اسلامی جمہوری فلاحی ریاست بننے کی دیر ہے ساری دنیا اس 'ماڈل' کو اپنانے کے لئے بے تاب ہے۔ ہم مسلمان محکوم و مقہور اور غیر ترقی یافتہ ہیں تو مغرب میں لوگ مسلمان ہوتے ہیں افراد سے افراد ہی بدلتے ہیں اگر پاکستان دورِ حاضر کی مثالی ریاست بن جائے تو دنیا بھر کی ریاستیں اسی نظریہ.....اسلام.....کو قبول کر لیں گی۔ ڈاکٹر رفیع الدین نے اسی بات کی وضاحت کے لئے "IDEALOGY OF THE FUTURE" کے نام سے کتاب لکھی کہ مستقبل کا علمی نظریہ

اسلام ہے۔

آیئے ــــــــــــ اس خصوصی اشاعت سے استفادہ کریں اور عہد کریں کہ ہم سب پاکستان کی نظریاتی ریاست کو حقیقی نظریاتی ریاست بنانے اور اس کے استحکام و بقا کے لیے نظریاتی نظام تعلیم کو لانے کے لیے بھرپور کوشش کریں گے، ڈاکٹر رفیع الدین نے اسی مقصد کے لیے "ISLAMIC EDUCATION" کے نام سے ایک ماہنامہ جریدہ بھی مارچ 68ء سے جاری کیا تھا جو ان مباحث کی وضاحت کرتا تھا مگر یہ جریدہ صرف ڈیڑھ سال جاری رہ سکا کہ ان کی وفات ہوگئی، بعد میں چوہدری مظفر حسین صاحب لاہور نے ایک عشرہ کے قریب اسے جاری رکھا مگر ماحول سازگار نہیں تھا اس لیے یہ نظریہ آج بھی روز اوّل کی طرح پاکستان کے استحکام و بقا میں دلچسپی رکھنے والے حضرات کی توجہ کا طالب ہے۔

اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے اور ہماری کوششوں کو بارآور فرمائے آمین۔ ہمارے لیے راستہ ایک ہی ہے اور وہ مسلسل جدوجہد اور سعیٔ پیہم کا راستہ ہے۔

فسعیًا ثم سعیًا ثم سعیًا

و ما عندی سوی ذاك المقال

حصہ اول

دوقومی نظریہ

دشمنوں کی خوفناک چالوں سے بچنے کے لئے

ایک حقیقت کا برملا اظہار

☆ تمہید
☆ برطانوی ہند کی اقوام
☆ 'ہند' میں مسلمانوں کی آمد
☆ مغلیہ دور کا آغاز 1526ء
☆ مغلیہ دور حکومت (دوراوّل 1526ء۔1707ء)
☆ مغلیہ حکومت (دور ثانی 1707ء۔1857ء)
☆ یورپی اقوام بالخصوص برطانوی استعمار کا ہند پر قبضہ (1753ء۔1857ء)
☆ انڈین نیشنل کانگریس 1885ء
☆ یورپی طاقتوں کا ابلیسی منصوبہ.....آثار قدیمہ کی کھدائیاں
☆ برطانوی راج میں صنعتی ترقی اور عوامی بہبود کے منصوبے
☆ مسلم لیگ کا قیام
☆ برطانوی ہند.....میں دوقومی نظریہ کا احیاء اور اہل علم کے مشورے

دوقومی نظریہ

دشمنوں کی خوفناک چالوں سے بچنے کے لئے

ایک حقیقت کا برملا اظہار

تمہید

انسان ایک تمدنی حیوان (SOCIAL ANIMAL) ہے اور مل جل کر رہتا ہے۔ اسی سے کنبے اور قبیلے وجود میں آتے ہیں اسی سے نسلیں اور قومیں تشکیل پاتی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌO

''لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کرو (اور) اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا (اور) سب سے باخبر ہے'' (49-13)

یہ گروہ اور قبیلے صرف پہچان کے لئے ہیں فضیلت کے لئے نہیں ہیں اگر چہ حضرتِ انسان نے اِسی فاسد بنیاد پر برتری اور فضلیت کے جھوٹے معیارات بنا لئے ہیں اور یہی دنیا میں ظلم زیادتی اور لوٹ کھسوٹ کی اصل وجہ ہیں۔ درحقیقت فضلیت صرف اور صرف تقویٰ یعنی خداخوفی اور اس کے نتیجے میں کردار کی بنیاد پر ملنی چاہیے مگر حیثیت، وجاہت، عہدہ، اختیارات اور وسائل کی بنیاد پر لوگ دوسروں پر اپنے غلط کردار کے باوجود فضلیت کا ناروا استحقاق ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے دنیا میں قتل وغارت، بدامنی اور دہشت گردی ہوتی ہے اور پسے ہوئے عوام اور اقوام ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کے اُصول پر اپنا دفاع بھی کرتے ہیں تو یہی خونریزی کی آگ اور بھڑک اُٹھتی ہے دنیا میں ایک طبقہ ہے جو ایسی صورت حال پیدا کر کے اس سے اپنا فائدہ حاصل کرتا رہتا ہے۔

یوں تو دنیا میں زبان، نسل، علاقہ، رنگ، پیشہ وغیرہ کی بنیاد پر ہزاروں قومیں آباد ہیں اور بعض لوگ مذہب، نظریات اور فلسفیانہ خیالات کی بنیاد پر بھی ایک قومی وحدت گردانے جاتے ہیں۔

برطانوی ہند کی اقوام

برطانوی ہند میں انسانوں کی کئی گروہ بندیاں صدیوں سے موجود تھیں۔ تاریخی طور پر 'ہند' ایک زرخیز علاقہ سمجھا جاتا تھا اور شمال مغربی اور مغربی علاقوں سے کئی قومیں سرزمین ہند میں آئیں۔ یہ قومیں متمدن اور اپنے زمانے کی حد تک ترقی یافتہ تھیں لہٰذا مقامی لوگوں پر حکمرانی بھی کرتی رہیں جیسے آریہ، افغان اور ایران کے لوگ۔ 'ہند' کے لوگوں اور مقامی تہذیب نے جلد یا بدیر ان 'بدیشی' حکمرانوں اور بدیشی نظریات رکھنے والوں کو اپنے اندر جذب کر لیا یا نکال باہر کیا۔ آریہ لوگ مقامی کلچر اور تہذیب اپنا کر اس میں جذب ہو گئے جبکہ 'بدھ مت' نے مزاحمت کی تو 'ہند' میں جنم لینے والا مذہب یہاں تو معدوم ہو گیا اور مشرق بعید وغیرہ میں آج بھی غالب عنصر کی حیثیت سے موجود ہے۔

'ہند' میں مسلمانوں کی آمد

حضرت محمد ﷺ (571ء۔632ء) کی تشریف آوری اور عرب اور مشرق وسطی، شمالی افریقہ اور ایران و افغانستان تک ان کے لائے ہوئے دین کے پھیلنے سے ''ہند'' کے ساحلی علاقوں پر ''عرب تاجروں'' کی آمد و رفت سے اسلام کا تعارف تو دورِ نبوی ﷺ ہی میں ہو گیا تھا اور انڈونیشیا اور مشرق بعید کے لوگوں نے اسلام قبول کرنے میں 'ہند' سے پہل بھی کر لی تھی مگر ہند میں ذات پات کی گہری تقسیم کی وجہ سے اسلام کا تعارف عوامی سطح پر عرصۂ دراز تک نہ ہو سکا۔

اسلام کا عوامی سطح کا تعارف 711ء میں حضرت محمد بن قاسم رحمہ اللہ کے سندھ کے راجہ داہر کے علاقے میں مسلمان خواتین کی بے حرمتی کے خلاف صدائے احتجاج پر توجہ نہ دینے کی پاداش میں حملہ کر کے علاقہ فتح کر لینے سے ہوا اور سندھ، بلوچستان اور جنوبی پنجاب کا آباد علاقہ (بشمول پوٹھوہار) مسلم حکومت کے زیر نگین آ گیا مسلمانوں کا اخلاق و کردار اور مقامی غیر مسلم اقلیتوں سے حسن سلوک نے لوگوں کو دورِ اوّل کے اس مسلمان حاکم کا گرویدہ بنا دیا پہلے منصورہ اور

بعدازاں ملتان اس حکومت کا دارالسلطنت تھا۔

'ہند' میں اسلام کا یہ 'ورود' خالص 'عربی الاصل' اور دورِ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا تھا چنانچہ دیبل (کراچی) سے لے کر اسلام آباد تک کئی جگہ ''صحابہ ﷺ'' کے مزارات ملتے ہیں۔

یہ دور حکومت مسلمانوں کے مرکز میں اختلاف کی وجہ سے زیادہ دیر نہ چل سکا اور 'ہند' کے ذات پات کی تمیز اور ہندومت کی تنگ نظری کے کچلے ہوئے عوام کے لئے ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اور حسین خواب کی حیثیت سے تاریخ کا حصہ بن گیا تاہم یہ حصہ اسلامی سلطنت کے سرحدی علاقوں کی حیثیت سے مسلمان علاقہ ہی رہا۔ (یاد رہے کہ یہ وہ دور ہے جس میں ہندومت اپنے عروج ثانی کے دور سے گزر رہا تھا اور ہندو نظریات کے مطابق جگہ جگہ مندر اور عبادت گاہوں کی عظیم الجثہ اور وسیع عمارتیں تعمیر ہو رہی تھیں اگرچہ یہ عبادت گاہیں سنگ تراشی میں ننگے انسانوں کے بتوں اور جنسی مناظر کی تجسیم کے بے ہودہ مجسّموں پر مشتمل تھیں۔ یہ مندر آج بھی قائم ہیں اور آج کے مادر پدر آزاد مغربی تہذیب کے دلدادہ حضرات کے لئے بہت زیادہ کشش رکھتے ہیں بلکہ مغرب کی بھارت سے دوستی و محبت کی پینگیں دراصل بے حیائی اور عریانیت کے میدان میں بھارت کی سبقت کے نتیجے میں ہیں کہ مغرب تو اس سے بہت پیچھے ہے۔ یہ مندر 600ء سے لے کر 1000ء تک تعمیر ہوئے ہیں اسی دوران میں تعمیر شدہ اسی طرح کا ایک مندر سومنات کا مندر بھی تھا جسے 1030ء میں محمود غزنوی نے گرا دیا تھا)۔

اسلام کی 'ہند' میں دوسری دفعہ آمد شمال مغرب یعنی درہ خیبر کے راستے سے ہوئی ہے۔ پہلے شہاب الدین غوری نے ہند پر حملے شروع کیے اور پھر محمود غزنوی نے۔ محمود غزنوی نے بالآخر غرنی سے سفر کر کے بہاولپور کے قریب سے پورا صحرائے چولستان عبور کیا ہے اور بمبئی کے قریب ساحل سمندر پر صوبہ گجرات کاٹھیاوار کے قریب ریاست جوناگڑھ میں سومنات کے مقام پر اس بڑے مندر کو فتح کیا ہے جس سے نفسیاتی طور پر مسلمانوں کو پورے ہند پر غلبہ حاصل ہو گیا۔

ابتداء میں ملتان مسلمانوں کی سرگرمیوں کا مرکز رہا اور پھر لاہور تاہم مسلمانوں کی پہلی آزاد حکومت 1206ء میں سلطان قطب الدین ایبک کے ہاتھوں قائم ہوئی جس کا دارالحکومت دہلی تھا۔ دہلی کا قطب مینار گزشتہ آٹھ صدیوں سے مسلمانوں کی اس آمد اور اخلاق و کردار کی عظمت

کے نشان کے طور پر قائم ہے۔اس کے بعد مسلمانوں کے پاس دہلی کی حکومت رہی اس کی حدود میں کمی بیشی ہوتی رہی تاہم مسلمان حکمرانوں کی عملداری کی حدود میں اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔

مسلمانوں کی حکومت کے قیام اور 'ارض ہند' میں اسلام کے فروغ اور مقامی آبادی کے مسلمان ہونے میں 'اسلام کے سفیروں' اور صوفیائے عظام کا بڑا کردار تھا۔ذیل میں 1206ء سے 1530ء تک مسلمان حکمرانوں کی تفصیل درج ہے:

1۔ 1206ء۔1290ء۔خاندان غلاماں: (نسلاً ترک) قطب الدین ایبک (غوری کا غلام) التمش۔رضیہ سلطانہ۔ناصر الدین محمود۔غیاث الدین بلبن (التمش کا غلام) منگولوں کے حملے۔

2۔ 1290ء۔1320ء خلجی خاندان: جلال الدین خلجی (چچا) علاء الدین خلجی (بھتیجے نے چچا کو قتل کیا) اس دور میں نظام الدین اولیاءؒ (دہلی)، رکن الدین (ملتان)، قطب الدین مبارک شاہ۔

3۔ 1321ء۔1413ء تغلق خاندان (ترک): غیاث الدین تغلق (منگولوں کو شکستیں دیں) محمد تغلق (بیٹا) فیروز شاہ تغلق (چچازاد) محمود تغلق (امیر تیمور کا حملہ) دہلی فتح،

4۔ 1414ء۔1451ء سید خاندان: سید خضر خان، سید علاء الدین عالم شاہ۔

5۔ 1451ء۔1526ء لودھی (پٹھان): بہلول لودھی۔سکندر لودھی (آگرہ کی بنیاد ڈالی) ابراہیم لودھی (پانی پت میں شکست)

مغلیہ دور کا آغاز 1526ء

ظہیر الدین بابر: ☆ 1526ء پانی پت کی جنگ میں ابراہیم لودھی کو شکست۔

☆ 1527ء رانا سانگا سے فیصلہ کن جنگ 12 ہزار بمقابلہ دو لاکھ کو شکست۔

☆ 1529ء بنگال کے حکمران نصرت شاہ کو شکست۔

اسی طرح 800ء سے لے کر 1528ء تک مسلمان صوفیاء، اولیاء اور مبلغین کے اسمائے گرامی بھی پیش خدمت ہیں:

شیخ علی بن عثمان ہجویریؒ (وفات 1072ء) لاہور، سید احمدؒ جو سلطان سخی سرور کے لقب سے مشہور ہیں (وفات 1181ء) شاہ کوٹ، حضرت خواجہ معین الدین اجمیری (وفات مارچ 1235ء) اجمیر، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (وفات دسمبر 1235ء) دہلی، شیخ

بہاء الدین زکریاؒ (وفات 1262ء) ملتان، حضرت شیخ فرید الدین مسعودؒ (وفات 1265ء) پاکپتن، حضرت نظام الدین اولیا (وفات 1325ء) دہلی،

ان صوفیاء عظام کا حسن کردار اور اسلام کی فطری تعلیمات تھیں کہ اسلام پھیلتا چلا گیا اور مقامی قبائل حلقہ بگوش اسلام ہوتے چلے گئے، جو قبائل اور باحیثیت لوگ مسلمان نہیں ہوئے وہ بھی دل سے اسلام سے متاثر ضرور تھے اگرچہ اپنے اغراض ومفادات کی بیڑیوں کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکے۔

مغلیہ دورِ حکومت (دوراوّل 1526ء۔1707ء)

1258ء میں سقوط بغداد کے بعد عالم اسلام میں مرکزیت ختم ہوگئی۔ اندلس (سپین) میں مسلم حکومت مستحکم تھی مگر بہت دور تھی کہ ایشیا کے ان علاقوں میں کوئی فیصلہ کن کردار ادا کر سکے۔ علاقائی مسلم حکومتوں کے بننے بگڑنے کے عمل کے دوران ہلاکو خان اور چنگیز خان جنہوں نے منگولیا (چین) سے آکر بغداد کو تہس نہس کر دیا تھا اور مسلمانوں کی حکومت کو فتح کر لیا تھا اسلام کی حقانیت نے انہیں کی اولاد کو مسخر کر لیا اور وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے۔ بقول علامہ اقبال

ہے عیاں شورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں کعبے کو مل گئے صنم خانے سے

چنانچہ پندرہویں صدی میں مستحکم ہونے والی عالم اسلام کی تین عظیم سلطنتوں عثمانی سلطنت ترکی میں، صفوی سلطنت ایران میں اور اس کے کچھ عرصے بعد مغلوں کی حکومت افغانستان اور پھر پورے ہندوستان میں۔ ان کے بانی یہی چنگیز خان اور ہلاکو خان کے خاندان کے لوگ تھے۔

مغل حکمران بابر نے 1526ء میں پانی پت کی پہلی لڑائی میں فتح حاصل کر کے ایک عظیم سلطنت کی بنیاد رکھی جو مختلف مراحل سے گزر کر 'ہند' میں اورنگ زیب رحمہ اللہ کے عہد میں کابل سے لے کر برما تک پھیلی ہوئی تھی۔

مغل حکمرانوں میں ظہیر الدین بابر (وفات 1530ء) نصیر الدین ہمایوں (وفات 1556ء) جلال الدین اکبر (وفات 1605ء) نور الدین جہانگیر (وفات 1627ء) شہاب الدین شاہ جہاں (وفات 1657ء) محی الدین اورنگ زیب عالمگیر (وفات 1707ء) کا دور سنہری دور اور 'ہند' کے استحکام اور خوشحالی کا دور ہے۔ اورنگ زیب نے اکبر کے لائے ہوئے الحاد

اور زندقہ کو ختم کر کے اسلامی قانون کو نافذ کیا اور اسلامی اُصولوں کے مطابق حکومت کی۔

مغلیہ دور میں ہندومت، جین بدھ مت، پارسی، عیسائی اور یہودیوں کے علاوہ دیگر اقوام بھی امن وسکون سے خوش وخرم زندگی گزار رہی تھیں۔ اتنی عظیم سلطنت میں علاقائی بغاوتوں اور سرکشی کی کوششوں کو چھوڑ کر مغلیہ دور 'ہند' کی یک جہتی اور استحکام کا دور ہے۔

مغلیہ حکومت (دور ثانی 1707ء۔1857ء)

اورنگ زیب عالمگیر نے پچاس سال حکومت کی مگر اس کے بعد اس کے جانشین اس عظیم وراثت کو سنبھال نہ سکے اور ملک میں انارکی پھیل گئی۔ حکمران عیاش، آرام پرست اور دین سے ہٹتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ حکومت میں شکست وریخت کا عمل شروع ہوا اور دور دراز علاقے کے سربرآوردہ لوگوں نے علیحدگی اور خودمختاری کا اعلان کر کے چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنانا شروع کر دیں بلوچستان پنجاب اور جنوبی ہندوستان کے علاوہ بنگال وغیرہ میں بھی یہی عمل شروع ہو گیا اور مغلیہ حکومت سکڑتی چلی گئی تا آنکہ 1857ء میں بالکل ختم ہوگئی۔

یورپی اقوام بالخصوص برطانوی استعمار کا ہند پر قبضہ (1753ء۔1857ء)

یورپ میں صنعتی ترقی کے نتیجے میں فرانس اٹلی، پرتگال نے تو اپنے ملک سے نکل کر قریبی ملکوں اور ساحلی علاقوں پر قبضہ جما لیا تاہم برطانیہ کو دور دراز کا علاقہ حصہ میں آیا ان اقوام نے پردیسی، مسکین اور بے گھر بن کر ساحلی علاقوں پر جگہ بنائی پھر تجارت کی آڑ میں قدم جما لیے اور اس کے بعد مقامی لوگوں کو کاروبار میں شریک کر لیا، خام مال وغیرہ کے حصول اور مقامی سطح پر مزدوروں کے ذریعے اپنا اثر ورسوخ بڑھایا۔ 1602ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام عمل آیا اور برطانوی ہند کا علاقہ اس کمپنی کے تصرف میں چلا گیا۔ دوسرے بنگال میں برطانوی تاجروں نے تجارت کے بھیس میں علاقے فتح کرنے اور حکومت کے حصول کی کوششیں کیں۔ مغل بادشاہ شاہجہاں (دور حکومت 1627ء تا 1657ء) سے چالاکی سے مراعات حاصل کیں اور تجارتی ٹیکس کی معافی (TAX EXEMPTION) کی آڑ میں اسلحہ جمع کرنا شروع کر دیا، اپنے زیر قبضہ علاقہ میں فوجی چھاؤنیاں تعمیر کر لیں اور مقبوضات میں توسیع کا عمل تیز کر دیا۔

ان مغربی طاقتوں کی مختلف علاقوں میں آمد دنیا کے دوسرے فاتحین کی آمد سے یکسر مختلف تھی۔ فاتح میدان جنگ میں بادشاہوں، راجوں اور مقتدر قوتوں سے میدان جنگ میں لڑتے تھے اور فتح پاتے تھے۔ جبکہ اس یورپی استعمار بالخصوص برطانوی استعمار کے پاس کوئی نظریہ، اخلاق، مذہب کی تبلیغ یا انسانی فلاح کا مشن نہیں تھا یہ تاجر تھے اور جھوٹ، فراڈ، رشوت، شراب، بے حیائی، بدکاری، بدعہدی، مقامی بدکردار لوگوں کو خرید کر اور لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لینا ان کے تزویراتی ہتھیار (STRETIGICAL INSTRUMENTS) تھے اور سب سے بڑھ کر مخالف کو پکڑ کر ان پر ظلم وستم کے روایتی رومی طریقے تھے جس سے علاقے پر دہشت پھیل جاتی تھی۔ کچھ عرصہ قبل مغرب میں چھپی ہوئی اہم کتاب ''تہذیبوں کا تصادم'' (CLASH OF CIVILASATION) کا مصنف اس حقیقت کو چھپانے کے باوجود نہیں چھپا سکا اور اُسے مغربی اقوام کے اس تسلط اور عالمی غلبے کا کوئی اخلاقی جواز ڈھونڈھنے سے بھی نہیں مل سکا وہ لکھتا ہے:

''..... 1500ء سے 1750ء کے درمیانی عرصے میں پہلی عالمی سلطنت کو قائم کرنے میں مغرب والوں کی کامیابی کا دارومدار ان کی جنگی استعداد میں اضافہ تھا۔ جس کو فوجی انقلاب کا نام دیا گیا ہے۔ مغرب نے دنیا کو اپنے نظریات یا اقتدار یا مذہب کی وجہ سے فتح نہیں کیا تھا بلکہ اس وجہ سے فتح کیا کہ منظّم تشدد کرنے میں اس کو برتری حاصل تھی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کو مغرب کے لوگ تو بھول جاتے ہیں لیکن غیر مغربی لوگ فراموش نہیں کر سکتے.....''

1753ء میں بنگال میں میر جعفر کو ساتھ ملا کر نواب سراج الدولہ کو شکست دی، میر صادق کو ساتھ ملا کر 1799ء میں سلطان ٹیپو کو شہید کر دیا اور جنوبی ہند کے سارے مشرقی ساحل پر قبضہ کر لیا۔ واقعی سلطان ٹیپو آخری چٹان تھی جس کے بعد اس بے رحم برطانوی استعمار کو دہلی پہنچے میں کوئی دیر نہیں لگی اور 1802ء میں مغلیہ حکومت کے مرکز میں مغل فرمانروار کے پاس انگریز ریزیڈنٹ بیٹھتا تھا اور اصل فیصلے وہی کرتا تھا بادشاہ تو برائے نام تھا تاکہ مسلمانوں میں بغاوت اور انتقام کے جذبات نہ پیدا ہوں۔ ہندو پہلے محکوم تھا برطانوی استعمار نے اس کو ساتھ ملایا اور مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا۔ برطانوی سامراج کے مسلمانوں پر مظالم کی داستانِ الم بہت

طویل ہے۔مسلمان تاجروں بااثر لوگوں کوقتل کرنا، ذلیل کرنا مقدمات میں پھنسانا وغیرہ ان کے حربے تھے۔تاریخ کے اوراق میں ان مظالم کی داستان محفوظ ہے۔

1857ء میں مسلمانوں میں آزادی کا جذبہ بیدار ہوااور آزادی کے لئے مسلح جدوجہد کا موقع آیا تو اس موقع پر ہندو مجموعی طور پر انگریز سے مراعات حاصل کر رہا تھا چند گنے چنے ہندو خاندان اس جدوجہد آزادی میں شریک ہوئے بلکہ ہندو اس موقع پر انگریزوں کو مسلمانوں کو کچل دینے کے مشورے دے رہا تھا تاکہ مسلمانوں سے ماضی کا انتقام لے سکے۔ 1857ء کے بعد سکون ہوااور پورا ہند کمپنی بہادر کے کنٹرول سے برطانوی تخت کے ماتحت ہو گیا تو اگلے پچاس سال برطانوی ہند میں قبرستان کی سی خاموشی تھی اس لئے کہ جذبہ آزادی کے حامل مسلمان لوگوں کو ڈھونڈ کر قتل کر دیا گیا تھا ہندوؤں نے مخبری کی خدمت انجام دے کر مراعات لی تھیں (اور یہی اُن کے مفاد میں تھا) اور 20 سال سے لے کر 50 سال کی عمر کے تمام بااثر اور مقتدر رہنما اور جوان پھانسیوں کی سزا پا گئے یا کالے پانی بھیج دیے گئے۔

انڈین نیشنل کانگریس 1885ء

برطانوی سامراج اور استعمار نے اپنے سارے ظالمانہ ہتھکنڈے استعمال کر کے مسلمانوں کے خلاف مندرجہ ذیل کام کیے:

(1) مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی مسلمانوں سے ہی انتقام اور سلطنت کی واپسی کے لئے جدوجہد کا خطرہ تھا لہٰذا مسلمانوں کو ہر طرح سے دبایا گیا تعلیم، فوج، عدلیہ، کاروبار ہر چیز سے محروم رکھا گیا اور ایسے قوانین بنائے کہ مسلمان اس طرف نہ آسکیں۔ جبکہ ہندو اور دیگر اقوام کو کھلے مواقع دیے گئے اور تجارتی مراعات دی گئیں۔

(2) مسلمانوں کی یکجہتی ختم کرنے کے لئے مسلمانوں میں سے میر جعفر اور میر صادق کی طرح کے ہزاروں لوگوں کو مراعات دے کر اپنا ہمنوا بنالیا۔ان مراعات میں جاگیریں اور علاقائی نوابی اور مرکز میں عمل دخل جیسے کام شامل تھے۔(اس جاگیردار اور مراعات یافتہ طبقہ کے زہریلے اثرات آج بھی ہماری سیاست اور اجتماعیت میں شامل ہیں)

(3) مسلمانوں کی مذہب سے والہانہ محبت اور حضرت محمد ﷺ سے فدائیت کے جذبے کو ختم

کرنے نیز قرآن مجید سے عقیدہ کمزور کرنے کے لئے 'جعلی' نبوت وغیرہ کے STUNTS کھڑے کیے گئے تا کہ مسلمان خود داخلی طور پر منقسم ہو جائیں اور مناظروں اور فروعی مسائل میں الجھے رہیں۔

(4) ملکی تعلیمی نصاب میں مسلمانوں کو ایسی تعلیم دی گئی کہ وہ اسلام سے دور ہوتے چلے جائیں اور اسلام کے غلبے اور شاندار ماضی کا خیال ان کے دل سے نکل جائے۔

(5) مزید برآں عیسائیت کی تبلیغ کی سرپرستی کی گئی اور مقامی باشندوں اور بالخصوص مسلمانوں میں سے عیسائیت قبول کرنے والوں کو دلکش مراعات دی گئیں۔

(6) مسلمانوں میں سے ذہین اور نمایاں طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے بہانے یورپ لے جا کر اپنے کلچر اور تہذیب میں رنگ دیا جاتا تھا تا کہ وہ واپس آ کر ساری زندگی یورپی تہذیب کے مبلغ بن کر زندگی بسر کریں۔

(7) مسلمانون کا علمی ورثہ اور مغلیہ حکومت کا خزانہ لوٹ کر انگلستان پہنچا دیا گیا۔

اسی طرح ہندو قوم نے بھی برطانوی استعمار کے سائے میں اپنے مکروہ عزائم کے لئے اس طرح کے کام کیے اور دوست بن کر اور انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کے جذبات کو استعمال کر کے نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں کیے گئے اہم کام یہ ہیں:

(1) مسلمانوں اور بالخصوص مسلمان مذہبی رہنماؤں کو جدید علوم سے دور رکھنے کیلئے مذہبی مناظروں اور فتنوں میں اُلجھا دیا گیا چنانچہ گلی گلی محلّہ محلّہ مناظرے اور علمی اکھاڑے برپا ہو گئے۔

(2) مسلمان عوام کو تعلیمی میدان میں پیچھے کرنے کیلئے اُن کے راستے میں مشکلات پیدا کی گئیں۔

(3) اسلام کی تعلیمات سے دور کرنے کے لئے ہندومت نے پہلے بھی کئی چالیں چلی تھیں تا کہ مسلمانوں اور ہندومت کا ملغوبہ تیار کر کے اسلام کو ختم کر دیا جائے جو ناکام ہو گئیں تھی جیسے: سکھ مذہب کی ابتداء اور پرورش (اگر یہ مذہب اپنی جڑیں ہندومت میں نہ رکھتا ہوتا تو 1947ء میں اس مذہب کے لوگوں کو مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہیے تھا جو نہ ہو سکا)، بھگتی کی تحریک، ولبھ اچاریہ کی سوامی تحریک، برہموسماج کی تحریک اور مہاتما گاندھی جی کی تحریک بھی مسلمانوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی تحریکیں تھیں۔

اس سلسلے کی اہم کوشش انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھنا ہے گویا سارے منصوبے

روبعمل ہوکر نتیجہ خیز ہو رہے ہیں اور اسلام کی علیحدہ حیثیت اور مسلمانوں کا علیحدہ وجود اب قصہٴ ماضی ہے اور زوال پذیر ہے۔ لہٰذا______ برطانوی ہند میں یکجہتی کے لئے مسلمان، ہندو، پارسی، بدھ مت سب کو اکھٹا کرنے کے لئے سازشی ذہن کے ساتھ برطانوی سامراج کی سرپرستی سے یہ کام ہوا جس سے اندرونی کہانی کی طرف یہ اشارہ ملتا ہے کہ اب درپردہ مقاصد کے حصول کا وقت قریب ہے اور ہند کے مسلمان عالم اسلام سے علیحدہ ہو کر اپنا ماضی بھول چکے ہیں لہٰذا ان کو جیسے چاہیں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

یورپی طاقتوں کا ابلیسی منصوبہ......آثار قدیمہ کی کھدائیاں
اور اس سے ہر قوم کے مشرکانہ اور گمراہ کن نظریات والے ماضی سے تعلق جوڑنے کی کوشش

دنیا بھر کی قومیں اور ان کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اس دنیا میں پہلے انسانی معاشرے سے لے کر آج تک ایک اللہ کا تصور موجود ہے جو خالق، مالک، رازق، ہر جگہ موجود، مقتدر بادشاہ اور ہر چیز پر قادر ہے۔ وحی، آسمانی ہدایت اور انبیاء ورُسل علیہم السلام کا تصور، حیات بعدالممات، جنت دوزخ، حساب کتاب کا تصور ایک تسلسل کے ساتھ موجود ہے۔ یہ بات بھی تاریخی طور پر ثابت ہے اور ہر قوم اور مذہب کے ماننے والے اپنی تاریخ اور 'اجتماعی' یادداشت میں اس حقیقت کے کئی شواہد رکھتے ہیں کہ انبیاء کی تعلیمات سے روگردانی، بت پرستی، شرک اور بے حیائی بدکرداری کی وجہ سے کئی قومیں اور تہذیبیں اپنے عروج کو پہنچ کر تباہ ہوگئیں۔

یورپی سامراج نے صنعتی ترقی کے بعد عالمی غلبہ حاصل کیا تو 'حصولِ علم' تلاشِ حقیقت اور تاریخی حقائق کے آشکارا کرنے کے لئے دنیا بھر میں تباہ شدہ بستیوں اور تہذیبوں کے' آثار' کو کھود کرید کر نکالنے کا منصوبہ بنایا۔ تمام تباہ شدہ بستیاں کھلی کتاب کی طرح سامنے آگئیں۔ بابل کی تہذیب، فراعنہ مصر کی تہذیب، گندھارا تہذیب، موہنجوداڑو، ٹیکسلا، ہڑپہ، وسطی اور جنوبی ہند کے ہندومت کے دورعروج ثانی (300ء۔1000ء) کے بنائے گئے معبد اور مندر سامنے آگئے۔

ان تمام کھدائیوں اور تحقیقات کے نتیجے میں برطانوی ہند سمیت دنیا بھر میں تہلکہ مچ

گیا۔ ایسے ہر مقام پر اور علاقائی مراکز میں عجائب گھر (میوزیم) بنائے گئے جہاں اس علاقے سے نکالے گئے بت، کاریگری کے نمونے اور دیگر نوادرات سجا دیے گئے۔ جیسے ٹیکسلا کے کھنڈرات کی سیر اور عجائب گھر کو دیکھنے کے بعد اس تہذیب کے بارے میں معلومات فوراً ذہن میں تازہ ہو جاتی ہیں اسی طرح دیگر مقامات کا حال بھی تھا۔

اس سب تگ و دو (EXERCISE) کا جو حاصل مقصود تھا وہ نکل آیا جو مغرب کو پسندیدہ تھا اور مغربی فلاسفر اسی رُخ پر عالمی رائے کو موڑ چکے تھے کہ ہر قوم کا ایک ماضی ہے اور ہر تہذیب کے آثار سے ظاہر ہے کہ وہ قومیں بت پرست تھی اور ان کے خاص طور پر طریقے تھے لہٰذا ــــــــــــ اس علاقے کے لوگوں میں 'نیشنلزم' اور 'قومی' وقار کے احساسات اجاگر ہوئے اور مغربی مفکرین نے اس کو ہوا دی جبکہ مغربی سامراج نے اجتماعی طور پر اور برطانوی ہند میں بالخصوص بت پرستی کو شہ ملی 'بدھا' کے مجسّمے ہماری ثقافت بن گئے 'گندھارا' ہمارا ماضی بن گیا موہنجودڑو کے آثار 'سندھی' قومیت کا نشان علم اور مونوگرام بن گئے۔ علیٰ ہذا القیاس مصر کے جدید تعلیمیافتہ طبقہ نے اپنا تعلق فراعنہ مصر سے جوڑا ان کے نظریات، تہذیب اور ترقی کو مثال سمجھ کر اپنانے کی کوشش کی۔ عراق میں بابل کے باغات اور تہذیب نے عراقیوں کا رُخ ادھر کر دیا۔ اُردن، شمالی سعودی عرب، مدائن صالح وغیرہ کے پیٹرا تہذیب کے پتھر میں کندہ مکانات اور عالیشان محلات نے وہاں کے لوگوں کا تعلق اپنے ماضی سے جوڑ دیا۔

عالمی سطح پر خالق کائنات، پیغمبر، وحی، آسمانی ہدایت، اخلاق و کردار پر بحث فضول قرار پائی اور سائنسی طریق (SCIENTIFIC APPROACH) سے ثابت ہو گیا کہ ہزاروں سال سے دنیا بت پرستی ہی کرتی چلی آ رہی ہے اور اسی سے وہ قومیں دنیاوی ترقی کر کے اہرام مصر، بابل کے باغات، پیٹرا کے محلات، ٹیکسلا کی یونیورسٹی، موہن جودڑو کے مثالی مکانات کی تخلیق کر گئیں۔ یہ ہمارا ورثہ ہے اور نیشنلزم کی آڑ میں لوک ورثہ، لوک فنکار، لوک آرٹ، لوک ڈانس، لوک دستکاری وغیرہ کی اصلاحات زبان زد عام ہو گئیں۔ اسلام سے رشتہ پہلے ہی غیر مرئی تھا اب وہ مزید تحلیل ہو گیا اور مغربی افکار کے لئے میدان ہموار اور راستہ صاف ہو گیا۔

اس عالمی مہم میں اقوام عالم کو نیشنلزم کی آڑ میں عالمی سوچ، عالمی فکر اور عالمی تہذیب کی

راہ پر ڈال دیا گیا۔ چنانچہ مشرق و مغرب میں ہر علاقہ، ہر تہذیب اور ہر مذہب کا پیروکار جدیدیت، ماڈرن ازم، تعلیم اور ترقی کے نام پر خدا بیزار، وحی سے دور اور انبیاء و رسل کے تصورات سے ذہناً لاتعلق ہو گیا اور عملاً مذہب، اللہ، رسول، وحی کو پاؤں کی بیڑیاں، ترقی کے راستے کی رکاوٹ اور مغرب کے ساتھ ہم قدم ہو کر چلنے سے روکنے والا سمجھنے لگا۔ چنانچہ برطانوی ہند کے مسلمان بھی اس خدا بیزار اور خدا ناشناس مہم کے اثرات سے اپنے آپ کو بچا نہ سکے بلکہ مغرب زدہ طبقہ اور جدید تعلیمافتہ مسلمان طبقہ اس نظریاتی، فلسفیانہ اور علمی حملہ میں شکست کھا گیا۔

برطانوی راج میں صنعتی ترقی اور عوامی بہبود کے منصوبے

برطانوی سامراج نے یہاں بہت سے ایسے منصوبے شروع کیے جو بنیادی طور پر تو اس غیر ملکی سامراج کے مقامی لوگوں میں اپنا تسلط مضبوط کرنے کے لیے تھے۔ اطلاعات کی بروقت فراہمی، حکومتی اہلکاروں کی تیزی سے نقل و حرکت، بغاوت کے خاتمے اور امن و امان کی بحالی کے کاموں کے لیے ملیشیا اور فوج کی آسان نقل و حرکت اور بروقت کاروائی کے لیے پیش قدمی اور برطانوی سرکار کی عملداری کی بروقت حفاظت ہی اصل منصوبہ تھا۔ تاہم اس نظریے سے شروع کیے عظیم منصوبوں سے عوام کو بھی بلا لحاظ مذہب و ملت بہت زیادہ فائدہ ہوا اور عوامی سطح پر رابطے اور نقل و حمل میں بے حد آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں تک برطانوی سامراج کو ہر ترقی یافتہ اور غالب قوم کی طرح (جیسا کہ گزشتہ دو عشروں سے امریکہ بہادر کو اپنے بارے میں زعم ہو گیا ہے کہ ان کا نظام ترقی کی آخری شکل ہے اور اب END OF HISTORY کا دور ہے اس سے آگے انسانی سوچ میں کسی ترقی اور پیش رفت کا امکان نہیں) یہ زعم ہو گیا تھا کہ ان کا اقتدار کبھی ختم نہیں ہوگا اور برطانوی غلبہ ایک دائمی PHENOMINON ہے۔ مشہور برطانوی فلسفی و مدبّر برٹرینڈ رسل (1873ء۔1970ء) لکھتا ہے:

> "WHEN I WAS YOUNG, EVERYBODY IN THE WEST ACCEPTED THIS DOMINATION AS A MATTER OF COURSE AND AS SOMETHING LIKELY TO CONTINUE INDEFINITELY"

برطانوی ہند میں تمام سرکاری منصوبوں سے یہی سوچ ظاہر ہوتی تھی۔سرکاری سطح پر کیے گئے بہت سے اقدامات اسی جانب کی پالیسی بحفاظت روبعمل آنے اور جاری رہنے کے لئے کیے گئے تھے۔ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

ڈاک کا مستعد نظام: اس نظام کے تحت اطلاعات ملک کے ایک کونے پشاور سے ڈھاکہ تک اور گوادر سے نیپال تک بڑی مستعدی سے اور خدمت کے جذبے سے پہنچ جاتی تھی اور لوگ گھر بیٹھے کم خرچ میں دور دراز سے اپنے عزیزوں رشتہ داروں کے حالات معلوم کر لیتے تھے اور تجارتی تعلقات رکھتے تھے بلکہ یہی نظام پورے برطانوی اقتدار میں جاری تھا اور انگلستان سے بھی اسی طرح عوامی سطح پر رابطے ممکن تھے۔

تار برقی کا نظام(TELEGRAPH): ٹیلیگراف اور ٹیلیگرام سے تحریری پیغام پورے ملک بلکہ برطانیہ بھی بھیجے جا سکتے تھے اور اس وقت چند گھنٹوں میں پیغام ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں پہنچ جاتا تھا۔سرکاری سطح کی اطاعات اور حکومتی معاملات میں آسانی کے ساتھ عوام کو بھی اس سے فائدہ ہوا۔ریلوے کے ملک گیر نظام سے انسان کے لئے سفر انتہائی آسان ہو گیا اور ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں معین وقت میں سہولت اور امن و امان کی کیفیت میں لوگوں کا آنا جانا جو پہلے خواب وخیال تھا اب عام انسان بھی اس سے مستفید ہو رہا تھا۔ اس سے پولیس،فوج اور حکومتی اہل کاروں کی بروقت آمد و رفت اور رابطے آسان ہو گئے عوام کے لئے دور دراز علاقوں میں کام کرنا ممکن ہو گیا پنجاب سے لوگ بنگال میں کام کرتے تھے سرکاری ملازم تھے فوج میں تھے چھٹی گزارنے پروگرام بنا کر آتے تھے مگر تار اور خط سے اطلاع دیتے تھے واپس پروگرام کے مطابق ریل سے سفر کر کے بروقت پہنچ جاتے تھے۔گھر بیٹھے خط لکھ کر یا تار برقی سے چھٹیوں میں توسیع یا ہزاروں میل دور آمد کی اطلاع دے سکتے تھے۔

اخبارات و رسائل کا اجراء: ملک میں حکومتی سطح کے اقدامات اور ملک کے مختلف گوشوں میں امن وامان کی صورت حال نیز موسموں کی تبدیلی، بیماری قحط وغیرہ کی خبریں اخبارات اور جرائد کے ذریعے انسان کو گھر بیٹھے روزانہ کی بنیاد پر مل جاتی تھیں جس سے عوامی سطح پر لوگوں کے رابطے اور ایک دوسرے کے حالات سے آگاہی اور مزاج کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہو گئی۔

ترقیاتی منصوبے ـــــ بیراج، نہریں اور بنجر علاقوں کی آبادکاری: عوامی سطح پر بے روز گاری ختم کرنے اور روزگار کے نئے ذرائع پیدا کرنے کے لئے حکومتی سطح پر دریاؤں کے پانی کو کنٹرول کرنے (جو پہلے سمندر میں جا گرتا تھا) کے لئے بیراج بنائے گئے، نہریں نکالی گئیں اور وسیع علاقے میں یہ مصنوعی آب پاشی کا نظام جاری کیا گیا اور کروڑوں ایکڑ بنجر علاقے آباد ہو گئے اس سے بڑا فائدہ تو حکومت کو سرکاری محصولات (REVENUE) کی شکل میں ہوا۔ تاہم ایک علاقے کے لوگوں کو دوسرے علاقوں میں آباد ہونے اور زرعی رقبے خریدنے کے مواقع سے مختلف علاقوں کے لوگوں کے باہمی رابطے ممکن ہو گئے۔ فیصل آباد، بہاولپور، رحیم یار خان اور سندھ کے نہری علاقے اسی طرح آباد ہوئے اور دوسرے علاقوں سے آبادگار (SETTLERS) نے آ کر یہ آبادکاری کا عمل آگے بڑھایا اس سے مقامی اور باہر کے لوگوں میں رابطے بڑھ گئے۔

تعلیمی نظام اور تعلیمی نصاب: مختلف علاقوں میں بہت تھوڑے فرق کے ساتھ اور مقامی زبانوں کا لحاظ رکھتے ہوئے برطانوی سرکار نے ایک ہی نظام تعلیم جاری کر دیا۔ اس نظام میں بنیادی طور پر سائنس اور مغربی افکار کی تعلیم تھی۔ سکول کی سطح پر جو فرق تھا وہ کالج کی سطح پر آ کر ختم ہو جاتا تھا اس سے مغربی تعلیم یافتہ لوگوں پر مشتمل ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو بلا لحاظ مذہب وملت زیادہ تر ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا تھا وہ بھی مغربی کلچر اور تہذیب۔ یہ بات ہندو کی چانکیہ سیاست کے عین مطابق تھی کہ مسلمانوں کو کسی طرح اپنے اندر جذب کر لو؛ لہٰذا ان حالات میں ہندو حالات کو موافق پا کر ہر میدان میں آگے بڑھ رہا تھا۔

اسی طرح سرکاری ملازمت، انڈین سول سروس، فوج وغیرہ کی ملازمت میں پورے ہند کی بنیاد پر ملازمت کے مواقع اور تبادلوں سے بھی مقامی لوگوں میں رابطے بہت بڑھ گئے۔

علی گڑھ کالج کا قیام: برطانوی سامراج کے ان سارے انتظامات سے حکومتی ضرورت پوری ہو رہی تھی کہ عوام میں رابطے پیدا ہوں، یگانگت ہو تا کہ امن و امان بحال رہے اور برطانوی سامراج کی حکومت کو دوام ہو۔ تاہم اسی دوران میں 1857ء کے بعد سرسید احمد خان نے ہندوؤں کی تنگ نظری اور تعلیمی میدان میں پیش قدمی کو مدنظر رکھ کر مسلمانوں کی تعلیم و ترقی اور مغربی افکار سے آگہی کے لئے علی گڑھ میں مسلمانوں کا الگ سکول جاری کیا جو آگے بڑھ کر چند

عشروں میں ہائی سکول اور پھر کالج کے درجے کو پہنچ گیا۔اسی کی تقلید میں مسلمانوں کی بیداری کے لئے دردمند مسلمانوں نے برطانوی ہند کے طول وعرض میں اسلامیہ سکول اور اسلامیہ کالج بنائے اور مسلمانوں کو تعلیم وترقی میں آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کیے۔

مسلم لیگ کا قیام

برطانیہ کی خواہش تھی کہ پورے ہند میں تمام لوگ ایک قوم پر رہیں اور سارے معاملات اس طرح چلیں اور حکومت کے لئے خطرات پیدا نہ ہوں تاہم مسلمانوں میں ماضی قریب کے واقعات اور عملاً ہندوؤں کی تنگ نظری اور ان کی مذہبی مجبوریوں کی وجہ سے مسلمانوں سے علیحدگی اور نفرت بھی اپنا اثر دکھا رہی تھی اور حکومتی کوششوں اور ہندوؤں کی اجتماعی امنگ کے باوجود مسلمانوں کا اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھنے کا جذبہ سرد نہیں ہوا تھا۔

ہندو ذہنیت اور حکومتی رٹ (WRIT) کو اس سے دھچکا لگا تاہم حکومت نے اپنے ذرائع سے جلد ہی مسلم لیگ پر سر آغا خان سوئم کو سربراہ بنا کر مسلط کر دیا چنانچہ اگلے 25 سال مسلم لیگ کوئی قابل ذکر کارنامہ سرانجام نہ دے سکی اور نہ ہی آل انڈیا بنیاد پر مسلم لیگ اپنا کوئی تشخص پیدا کر سکی۔

برطانوی ہند.....میں دوقومی نظریہ کا احیاء اور اہل علم کے مشورے

ہندو مسلم بقائے باہمی تو مختلف ادوار کی ضرورت رہی ہے اور حکومتوں کو اپنے استحکام اور امن وامان کے لئے مجبوری بھی۔تاہم ہندو مسلم نہ ماضی کی بارہ صدیوں میں (711ء تا 1910ء) ایک ہوئے تھے اور نہ آئندہ ہونے کا امکان تھا۔یہ بات ہندو کی ذہنیت اور عزائم کے خلاف تھی اور اُسے بہت چبھتی تھی اور عالمی سوچ اور برطانوی سامراج بلکہ اس کے سرپرستوں کے منصوبوں کے بھی خلاف تھی۔تاہم تیسری طرف برطانوی سامراج اور ہندو گٹھ جوڑ کی ڈیڑھ صدی کی کوششوں کا حاصل بھی خاطر خواہ نہیں تھا اور مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہو سکے تھے اور ہندو کی ہٹ دھرمی اور رعونت نیز مذہبی برتری کا احساس ہمیشہ مسلمانوں کو اس سمت میں کسی بھی پیشرفت سے بچا لیتی رہی۔

تقسیم بنگال کے موقع پر ہندو کی ہٹ دھرمی، معاشی میدان میں

مسلمانوں کو پیچھے دھکیلنے کا عمل، سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو ختم کرنے کی کوشش اور 'ایک قوم' کے نظریہ کے تحت اکثریت کے بل بوتے پر سارے وسائل، ملازمتوں، مراعات پر قبضہ کی ذہنیت نے مسلم اور غیر مسلم زعماء کو سوچنے پر مجبور کر دیا اور بیسویں صدی کے آغاز سے قبل ہی برطانوی ہند میں ہندو مسلم دو قوموں کے نظریہ کی آوازیں سنی جانے لگیں ان میں سے چند مشہور آراء حصہ دوم میں دی گئی ہیں۔

حصہ دوم

دوقومی نظریے کا فروغ

- ☆ ہندو اور مسلمان تہذیب کے عبادت اور محبت کے نشان
- ☆ دوقومی نظریے کا ارتقاء
- ☆ برطانوی ہند کی عوامی رائے
- ☆ مسلمان حکمرانوں کا ہندوؤں اور دیگر غیر مسلم اقوام سے رویہ
- ☆ دور غلامی میں ہندوؤں کا مسلمانوں سے رویہ
- ☆ مسلمان عوام کی اجتماعی رائے
- ☆ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاسِ الٰہ آباد (دسمبر 1930ء) میں علامہ اقبال کا صدارتی خطبہ
- ☆ (قائداعظم) محمد علی جناح کا ''دوقومی نظریہ'' کے بارے میں شدتِ احساس
- ☆ (قائداعظم) محمد علی جناح کی انگلستان سے واپسی
- ☆ 23 مارچ 1940ء قرارداد پاکستان کی منظوری

دوقومی نظریہ کا فروغ

تاج محل اور وسطی ھند کے بدنام زمانہ مندر

ہندواور مسلمان تہذیب کے عبادت اور محبت کے نشان

آمنے سامنے

تاریخ انسانی شاہد ہے کہ جب کسی علاقے میں کوئی قوم یا اجتماعیت سیاسی اقتدار حاصل کر کے علاقے میں مستحکم حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی ہے تو اُس نے اپنے وسائل سے اپنے نظریات کی روشنی میں سابقہ اقدار و روایات سے ہٹ کر 'نئی دنیا' تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے یہ اُس کا حق بھی ہوتا ہے اور اس طرح طرزِ تعمیر، طرزِ بود و باش، آرائش و زیبائش کے طریقے، باغات، شہر، عبادت گاہیں، سیر و تفریح کے مقامات کی نوعیت اور طریقے سب اُس قوم کے نظریات کی عملی تفسیریں بن کر اقوام عالم کے سامنے آجاتے ہیں۔ بابل کے معلّق باغات ہوں یا اہرام مصر، یونان کے بادشاہوں کے محلات اور تھیٹر ہوں یا ایران کے جمشید بادشاہ کے محلات، بنو عباس کا بغداد ہو یا ہندوستان کے راجے مہاراجے سب اپنے اپنے دور میں بقائے دوام کی ایک دبی ہوئی خواہش کو اپنی سوچ، فکر، نظریہ اور مذہب کی حدود اور تصورات کے اندر رہتے ہوئے صفحۂ ہستی پر اپنے 'خوابوں' کی دنیا تعمیر کر کے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب یہ اہل علم اور دانشور حضرات کا کام ہے نیز باشعور عوام کا بھی کہ وہ دیکھیں کہ کس تہذیب کے مذہب کے مطابق ایک مثالی انسان، مثالی خاندان اور مثالی معاشرہ کے خدوخال کیا تھے؟ یاد رہے کہ اس میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے کہ سچائی، راستی، عدل و انصاف، شرم و حیا، عفت و عصمت، چادر اور چار دیواری کو دنیا بھر میں معروف سمجھا جاتا ہے اور عریانیت، فحاشی، بے حیائی اور بے ہودگی، لچر پن اور سفلی جذبات کا برملا اظہار اور نمائش کو اخلاقی دیوالیہ پن کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔

سرزمین ہند میں ایک وقت میں ہندومت کا عروج تھا اور تقریباً 1000 ق م سے 1000ء تک وقفے وقفے سے شمالی اور جنوبی ہند میں مستحکم ہندو راج رہا ہے اور مجموعی طور

پر علاقائی راجے مہاراجے بھی اسی ہندو مذہب کے پیروکار تھے پھر مشرق بعید سارا اسی ہندومت کے زیر اثر تھا یہاں تک کہ بدھ مت چین جاپان سمیت سارے مشرقی ممالک میں آج بھی موجود ہے۔

ہندومت نے اپنے دور عروج میں بے شمار مندر تعمیر کیے جہاں ان کی سوچ کے مطابق بت پرستی کے لئے بت رکھے گئے اولاً یہ ''معبود'' جو بتوں کے انسان نما مجسّمے تھے سب '' ننگے'' اور بے لباس بنائے گئے۔ دوسرے ان کے مشہور مندر (جو آج مغربی سیّاحوں کے لئے انتہائی دلچسپی کا سامان مہیا کرتے ہیں جہاں بے حیائی اور جنسی اختلاط کے مناظر بھی بڑے بڑے مجسّموں کی شکل میں ایک دو نہیں ہر مندر کے طرز تعمیر میں ہزاروں کی تعداد میں لگا دیے گئے ہیں ایسا ہی ایک 'بے حیائی' کا مظہر بت خانہ اور فحاشی، عریانی کے مجسّموں کا 'منبع' سومنات کا مندر تھا جسے 1030ء میں سلطان محمود غزنویؒ نے توڑ دیا تھا۔ ان مندروں میں غیر ملکی سیاح تو 'سیر سپاٹے' کے لئے جاتے ہیں جبکہ ہندو عوام خاندان سمیت (WITH FAMILY) ان 'مذہبی مقامات' کی 'یاترا' اور 'عبادت' کے لئے جاتے ہیں۔ خدا معلوم باپ اپنی بیٹی کو بیٹے کو بہو کو..... باپ دادا، نانا نانی کی موجودگی میں ان مقامات کی کیا تشریح کرتے ہوں گے۔ اس سے ہندو مذہب کی سوچ، عقائد، نظریات اور اخلاق کے بارے میں ایک رائے بنانے میں مدد ملتی ہے۔

دوسری طرف ہند میں مسلمان بادشاہ بھی حکمران رہے جن میں سب سے طویل اور 'بھارت گیر' غلبہ مغل دور کا ہے۔ زیادہ تفصیل میں نہ جائیں۔ اکبر بادشاہ مذہبی انسان تو کیا اپنی مسلمانی کے بارے میں 'دین الٰہی' ایجاد کر کے ''ھم یومئذ اقرب للکفر من الایمان'' کا مصداق تھا تاہم اس کے مقبرے پر بھی 'ننگے بت'، بے حیائی، عریانی، فحاشی کے مناظر آج بھی نہیں نظر آتے شاہ جہاں بادشاہ اکبر بادشاہ سے بہتر مسلمان تھا بادشاہ تھا وسائل تھے مسلمان مؤرخین اُسے کوئی 'ولی اللہ' بنا کر پیش نہیں کرتے اس کی اکلوتی بیوی..... ممتاز محل اس کی محبوبہ تھی اسی سے اس کے ہاں چودہ اولادیں ہوئیں اگر شاہ جہاں کا مزاج عیاشی اور بدکاری کا ہوتا تو وہ کئی بیویاں اور داشتائیں اپنے 'حرم' میں داخل کر لیتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس کی بیوی ممتاز محل فوت ہوئی تو صرف اسی کردار اور عفت و عصمت کی سوچ کی وجہ سے ہی اُسے بیوی کے انتقال کا

ازحد صدمہ ہوا اور اس نے اس کی یادگار تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا تو ''تاج محل'' کے نام سے اپنے نظریات کی روشنی میں ایک 'پیکر محسوس' صفحہ ہستی پر منتقل کر دیا عام ذہن یہ تسلیم کرے گا کہ یہ ایک محبت کی نشانی ہے اور مقتدر باوسائل بادشاہ کی تعمیر کردہ عمارت ہے اس میں اگر ننگے بت ہوتے، جنسی مناظر مجسمائے جاتے اور خشت اوّل سے خشت آخر تک سجا دیے جاتے کوئی اس پر بہت زیادہ معترض نہ ہوتا کہ یہ تو ہے ہی محبت کی نشانی۔

مگر آفریں ہے شاہ جہاں کی مسلمانی سوچ اور مذہب اسلام کی پاکیزہ تعلیمات پر کہ ایک مقتدر باوسائل بادشاہ کی محبت کی یادگار میں ایک بت نہیں ہے آیات قرآنی میں صاف ستھرا سفید پتھر سے تعمیر شدہ، ہوا دار روشن تاج محل ہے جس کے احاطے میں ایک مسجد ہے۔ تعمیراتی توازن (SYMMETRY) قائم رکھنے کے لئے مقبرے کے مشرقی جانب مسجد نما مہمان خانہ ہے مسجد بناتے تو قبر کو سجدے کا شائبہ ہوتا۔

حتیٰ کہ شاہ جہاں اور ممتاز محل کا کوئی بے لباس تو کیا بالباس مجسمہ بھی وہاں نصب نہیں ہے۔ ایک طرف ہندومت کی 'مذہبی عمارتیں' اور 'عبادت گاہیں' جو 'کھجوراہو مندروں' کی شکل میں وسطی ہند میں موجود ہیں (بلکہ پورے بھارت اور نیپال اور مشرقی بعید میں بھی پھیلے ہوئے ہیں)۔ جہاں بے حیائی کے ایسے مناظر ہیں کہ کوئی شریف النفس آدمی فیملی کے ساتھ تو کیا اکیلا بھی جانا پسند نہ کرے نامعلوم آج کا باضمیر ہندو ان مندروں کی یاترا کے دوران اپنے بچے بچیوں کے سامنے اس کی کیا توجیہ پیش کرتا ہوگا۔ دوسری طرف ایک مسلمان بادشاہ کی محبت کی یادگار ہے جو اتنی پاکیزہ، صاف شفاف اعلیٰ انسانی اقدار کی حامل اور فن تعمیر کا جیتا جاگتا شاندار نمونہ ہے۔

یہ تاج محل ہندومت اور اس کی تہذیب کے منہ پر ایک طمانچہ سے کم نہیں۔ کیا کھجوراہو ٹمپلز (KHAJURAHO TEMPLES) اور تاج محل کے "ICON" رکھنے والی دو قومیں ایک ہوسکتی ہیں.....کوئی عقلمند، باشعور، باضمیر اور COMMON SENSE رکھنے والا شخص اس کے حق میں رائے نہیں دے سکتا۔

دوقومی نظریے کا ارتقاء

(ماخوذ از ہفت روزہ ندائے خلافت لاہور، جلد 12، شمارہ 29)

پہلے باب میں ہم تفصیل سے اپنا یہ نقطۂ نظر واضح کر چکے ہیں کہ ''نظریۂ پاکستان'' اور چیز ہے اور دوقومی نظریہ اور چیز۔ یہ دوسری بات ہے کہ برعظیم پاک و ہند کے خصوصی حالات کی حد تک دونوں کے درمیان لازم وملزوم کا رشتہ ہے اور دونوں ایک ہی ڈوری میں گُندھی ہوئی دولڑیاں نظر آتی ہیں۔ دونوں نظریات کی ملی جلی کیفیت کے حوالے اور مثالیں پچھلے ابواب میں دیے گئے ہیں۔ البتہ دوقومی نظریے کی الگ سے وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس پر بے شمار کتابیں تصنیف ہو چکی ہیں اور ابھی مزید لکھی جائیں گی۔ یہاں صفحات کی تحدید کے باعث دوقومی نظریے کا تاریخی ارتقاء سنین کے آئینے میں جھلکیوں کی صورت میں دکھایا جا رہا ہے:

630ء کے لگ بھگ: بقولِ قائداعظمؒ ''پاکستان اسی دن وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔''

711ء: محمد بن قاسم کی قیادت میں مسلمانوں کا اجتماعی ورود

1600ء تا 1857ء: مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، ٹیپو سلطان اور سید احمد شہید کی اسلامی نشاۃ ثانیہ کیلئے تحریکیں، جو مسلمانوں کو ہندو تہذیب سے نکالنے اور اسلام کی طرف رجوع کرنے کیلئے تھیں۔

1857ء: انگریز کے خلاف کھلا انقلاب۔ ہندوؤں نے انگریزی اقتدار جمانے میں مدد کی' اور مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف تحریکیں چلائیں۔

1858ء: جان برائٹ نے برطانوی پارلیمنٹ میں ایک بل پر بحث کرتے ہوئے کہا: ''ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں، جہاں مختلف قومیں اور زبانیں ہیں، ایک متحدہ اور مستحکم سلطنت کبھی قائم نہیں ہو سکتی۔''

1867ء: بنارس کے کمشنر کے سامنے مسلمانوں کی تعلیم کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے سرسید احمد خان نے کہا: ''اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے۔ آگے آگے ان سے زیادہ مخالفت اور عناد اُن لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ

کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا، وہ دیکھے گا۔''

1869ء: جمال الدین افغانی نے ہندوستان میں ہندو مسلم مسئلے کے حل کے لئے ایک ایسی اسلامی جمہوریہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی، جس میں وسط ایشیا کے اسلامی ممالک، افغانستان اور برعظیم کے مسلم اکثریت کے علاقے شامل ہوں۔

1884ء: سر جان سٹریچی نے کہا: ''ہندوستان نہ ایک ہے، نہ کبھی ایک تھا۔ برطانوی راج سے جو اتحاد پیدا ہو گیا ہے وہ محض مصنوعی ہے اور اس سے کبھی ایک متحدہ قومیت جنم نہیں لے سکے گی۔''

1887ء: سرسید کے رفیق کار مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی مشہور و مقبول نظم ''شکوۂ ہند'' کہی جس کے پہلے شعر میں دو قومی نظریے کی طرف اشارہ ہے:

؎ رخصت اے ہندوستان، اے بوستانِ بے خزاں
رہ چکے تیرے بہت دن ، ہم بدیسی مہماں

اس نظم کے دوسرے بند میں مولانا حالی نے مزید وضاحت سے ہندو اور مسلمانوں کو دو الگ الگ قومیں قرار دیا:

؎ تھی ہماری قوم و ملت، رسم و عادت سب جُدا
رشتہ و پیوند کوئی ہم میں اور تجھ میں نہ تھا
بول چال اپنی الگ تھی، اُردو زباں تیری الگ
تجھ سے ہم تھے اجنبی، اور ہم سے تو نا آشنا

1888ء: اُردو کے پہلے ناول نویس اور سرسید تحریک کے ایک اور رُکن ڈپٹی نذیر احمد نے 15 اکتوبر 1888ء کو ٹاؤن ہال دہلی میں انڈین کانگریس کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا: ''ایک طفلِ مکتب جس کو ہندوستان کے جغرافیے اور تاریخ سے کچھ بھی مناسبت ہے، لفظ انڈین کے ساتھ لفظ ''نیشنل'' سن کر کان کھڑے گا کہ کجا ہندوستان اور کجا نیشنلٹی۔ تمام روئے زمین پر کوئی ایسا ملک نہیں ہے کہ جس میں اس کثرت سے مختلف العقائد، مختلف الرسم، مختلف العادات اور مختلف الاعراض قومیں رہتی ہوں جیسے ہندوستان میں۔ پس ایسے اجزائے متضاد کو یکجا کر کے ایک معجونِ مرکب کو ''قومِ واحد'' قرار دینا صرح مغالطہ دہی ہے' مگر کس کو؟ ان بھچ انگریزوں کو جو انڈیا کا اتنا

ہی حال جانتے ہیں کہ ایک بڑی زرخیز کالونی ہے اور بس۔ بھلا شکمی تفریقوں کا لحاظ نہ بھی کرو اور ہندو ہندو ایک' اور مسلمان مسلمان ایک قوم سمجھو تو خیر یہاں تک بھی مضائقہ نہیں، مگر ہندو اور مسلمان کیونکر ایک قوم میں شامل ہو کر ''انڈین نیشن'' کہلا سکتے ہیں۔ گنگا اور سندھ کا سنگم ہو سکتا ہے اور نہیں ہو سکتا تو ہندو اور مسلمان کا۔''

1890ء: مولانا عبدالحلیم شرر: ''بہتر ہوگا کہ ہندوستان کو ہندو اور مسلمان صوبوں میں تقسیم کر کے تبادلۂ آبادی کر لیا جائے۔''

1899ء: تھیوڈور مارلیسن: ''براعظیم کی پوری مسلم آبادی کو آگرے سے لے کر پشاور تک کے علاقے میں مجتمع کیا جائے۔''

1917ء: اشتراکیت کی بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ اسٹاک ہام میں ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور ان کے چھوٹے بھائی پروفیسر عبدالستار خیری نے ایک تحریری بیان میں برعظیم کو مسلم اور ہندو ریاستوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ پیش کیا۔

1920ء: بعض تعلیم یافتہ مسلمانوں نے تحریک خلافت کی سخت مخالفت کی تھی۔ ان میں آگرہ کے ایک وکیل نادر علی بھی شامل تھے۔ اُنہوں نے 1920ء میں ایک پمفلٹ شائع کیا، جس میں ہندو مسلم مسئلے کا حل پیش کیا کہ ہندوستان کو مذہبی بنیاد پر 'ہندو انڈیا' اور 'مسلم انڈیا' میں تقسیم کیا جائے۔

1920ء: محمد عبدالقادر بلگرامی نے گاندھی جی کے نام ایک کھلا خط لکھا: جس میں ہندوستان کو مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تقسیم کرنے کی تجویز کی دلائل کے ساتھ حمایت کی۔

1922ء: انجمن اسلامیہ، ڈیرہ اسماعیل خان کے صدر سردار علی خان نے ایک کمیشن کے روبرو اپنا نظریہ ان الفاظ میں پیش کیا: ''ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ 23 کروڑ ہندوؤں کو جنوب میں اور 8 کروڑ مسلمانوں کو شمال میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ راس کماری سے آگرہ تک کا علاقہ ہندوؤں کو اور آگرہ سے پشاور تک سارا علاقہ مسلمانوں کو دے دینا چاہیے۔''

1923ء: بھائی پرمانند، مشہور ہندو رہنما: ''ہندوستان کو اس طریقے سے تقسیم کیا جا سکتا ہے کہ ایک خطے میں اسلام کو برتری حاصل ہو اور دوسرے خطے میں ہندومت کو۔''

1924ء: مولانا حسرت موہانی نے مسلمان اکثریتی صوبوں کو مسلمان ریاستوں میں اور ہندو اکثریتی صوبوں کو ہندو ریاستوں میں بدلنے کا منصوبہ پیش کیا۔

1924ء: لالہ لاجپت رائے' مشہور ہندو رہنما نے چون و چرا کے بعد ہندوستان کی تقسیم کا ایسا منصوبہ پیش کیا جس کے مطابق اُنہوں نے قبول کر لیا کہ مسلمانوں کو شمالی مغربی سرحدی صوبہ، مغربی پنجاب، سندھ اور مشرقی بنگال دے دیا جائے۔

1925ء: مولانا محمد علی جوہر نے برعظیم کے شمالی، خطوں کے لوگوں کے لئے اقتصادی، عسکری، مذہبی اور معاشرتی اسباب و وجوہ کی بناء پر علیحدگی اور حق خود ارادیت کی حمایت کا اعلان کیا۔

1925ء: ولیم آرچی بالڈ، پرنسپل ایم او کالج، علی گڑھ نے شمال مغربی علاقے اور افغانستان کے مضبوط مسلم اتحاد کی پیش بینی کی۔

1928ء: سر آغا خان: جب ہندوستان غیر ملکی تسلط سے آزاد ہو جائے گا تو اس کی وحدانی، غیر وفاقی حکومت نہیں ہو سکتی، شمال مغرب اور مشرق کے مسلمان اپنی مرضی کی آزاد ریاستیں بنائیں گے۔

1929ء: نواب سر ذوالفقار علی خان صدر مجلس استقبالیہ آل انڈیا خلافت کانفرنس: ''مسلمانوں کو بجائے حقوق کے، ایک جداگانہ ملک اور وطن کا مطالبہ کرنا چاہیے۔''

1930ء: علامہ اقبال کا خطبۂ صدارت، آل انڈیا مسلم لیگ الٰہ آباد ''بہتر ہوگا کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبے، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک مملکت بنا دیا جائے جو سلطنتِ برطانیہ کے اندر یا باہر' حکومت خود اختیاری رکھتی ہو۔''

1933ء: چوہدری رحمت علی' کیمبرج کے ایک طالبِ علم نے ایک انگریزی پمفلٹ "NOW OR NEVER"(اب یا کبھی نہیں) شائع کیا، جس میں لفظ ''پاکستان'' پہلی مرتبہ استعمال کیا گیا۔

1938ء: قائداعظم کے زیر صدارت منظور شدہ قرارداد سندھ صوبائی مسلم لیگ: ''ہندوستان کو دو وفاقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی مسلم ریاستوں کا وفاق اور غیر مسلم ریاستوں کا وفاق۔''

1939ء: چوہدری خلیق الزماں اور عبدالرحمان صدیقی لندن گئے تو وہاں وزیر ہند سے اپنی ملاقات کے دوران تقسیمِ ہند کی تجویز پیش کی۔

1939,1938ء: ان دو برسوں کے دوران میں مختلف حضرات نے مسلم خطوں اور جداگانہ آزاد

ریاستوں کے قیام کی تجویزیں پیش کیں، جن میں ڈاکٹر عبدالطیف (حیدرآباد)، سرسکندر حیات خان (پنجاب)، میاں کفایت علی، ڈاکٹر سید ظفرالاحسن اور ڈاکٹر ایم افضل قادری (علی گڑھ) کی پیش کردہ تجاویز کی نسبتاً زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

برطانوی ہند کی عوامی رائے

اوپر تبصرے اور آراء اہل علم اور دانشور حضرات کی تھیں۔ ہندو اور مسلم دونوں طرف کے مخلص اور بے لوث دانشور محسوس کرتے تھے اور صحیح محسوس کرتے تھے کہ ہندو مسلم دو الگ اکائیاں ہیں اور انسانوں کو اکٹھے رہنے اور یکجان ہو کر پُر امن معاشرہ تشکیل دینے کیلئے جو بنیادی اوصاف درکار ہیں وہ یہاں مفقود ہیں۔ ان دانشور حضرات کے یہاں یہ دلائل اعلیٰ علمی حلقوں اور پریس میں زیر بحث تھے۔ مگر برطانوی ہند کے عوام گزشتہ کئی صدیوں کے تعامل (INTERACTION) اور باہمی رویّوں سے ایک دوسرے کو جانتے تھے کہ دونوں ایک وحدت نہیں ہیں اور نہ ہی مصنوعی طور پر تخلیق کردہ کسی سیاسی وحدت میں امن اور آشتی کے ساتھ زندہ رہ سکتے ہیں۔

کتابوں میں درج نظریات، آراء، احکام اور مذہبی آزادیوں اور پابندیوں سے ہٹ کر ہر قوم کا ایک مزاج ہوتا ہے اور اس مزاج کو عوامی سطح پر روزانہ کی بنیاد پر عوام ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ قوموں کے رہنما اور مقتدر حضرات بعض اوقات باہمی مجلسوں میں جھوٹ، دھوکا، غلط بیانی کا ارتکاب کرتے ہیں اور منافقت کا لبادہ بھی اوڑھ لیتے ہیں اس لئے کہ اس سطح پر ہر روز کا رابطہ نہیں ہوتا۔ مگر کسی دفتر میں صاحب (BOSS) اور ماتحت کا رابطہ اور آمنا سامنا تو روزانہ کئی مرتبہ ہوتا ہے اور مفادات بھی ٹکراتے ہیں۔ دکاندار گاہک کا تعلق، سیٹھ اور ملازم کا تعلق، سفر میں ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے کا رویہ، پڑوسی کا تعلق، ملازمت اور مزدوری کے مواقع میں سبقت ایسے مواقع تھے جو عوام کو روز درپیش تھے۔

مسلمان حکمرانوں کا ہندوؤں اور دیگر غیر مسلم اقوام سے رویہ

مسلمانوں کا ہندو قوم اور دیگر غیر مسلم اقوام سے رویہ تو سامنے تھا مسلمان یہاں صدیوں حکمران رہے اور یہاں کی مقامی آبادی اور اقلیتیں جانتی تھیں کہ حکمرانوں نے کبھی ظلم اور

ناانصافی نہیں کی بلکہ انہیں حقوق دیے، ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کی، مذہبی آزادی دی۔ زبردستی کرتے تو مسلم اکثریت میں ہو جاتے کم از کم ہندومت کی نیچ قومیں تو ضرور اسلام قبول کرلیتیں۔ مسلمانوں نے حسن اخلاق، باہمی عزت واحترام، انسانی حقوق، روزگار کے مواقع، سلطنت کے امور میں شرکت اور مذہبی آزادی کا نمونہ بن کر دکھایا۔

لہٰذا ــــــــــــ پورے ہند کے عوام جانتے تھے اور صدیوں کے تعامل کے بعد یہ حقیقت ان کے لاشعور کا حصہ بن چکی تھی کہ مسلمان حکمران اپنے عوام اور خلقِ خدا کے لئے کیا رویہ رکھتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمان جب حکمران تھے تو انہوں نے ہم پر زیادتی نہیں کی تو جب مسلمان حکمران نہیں ہیں تو ہم پر کیسے زیادتی کریں گے یا ناانصافی کا رویہ اپنائیں گے۔ دوسری جانب ہندو قوم کا رویہ ہند کے دیگر مذاہب بالخصوص اسلام کے ساتھ اور مسلمانوں کے حق میں بڑا جارحانہ تھا۔ حالانکہ دونوں ڈیڑھ دو صدیوں سے ایک ہی سامراج..... برطانوی سامراج کے غلام چلے آرہے تھے لہٰذا..... مسلمانوں کے لیے یہ بات تصور سے ماورا تھی کہ اگر حالات نے پلٹا کھایا اور ہندو حکمران بن گیا تو اپنی عددی اکثریت کی بنا پر مسلمانوں کے ساتھ عدل وانصاف اور انسانی حقوق کی ادائیگی کا طرزِ عمل ہی اپنائے گا۔ اکثر مسلمان رہنما اور عوام دونوں محسوس کرتے تھے کہ عالمی سطح پر جمہوریت کا دور ہے اور کسی قوم کی عددی اکثریت کو اپنے علاقے میں حکومتیں بنانے اور گرانے کے عمل میں بنیادی کردار حاصل ہے لہٰذا آئندہ آنے والے دور میں ہندو مسلمان اقلیت کے ساتھ اپنے دورِ حکمرانی میں ظلم اور ناانصافی کا رویہ رکھے گا، حقوق غصب کرے گا اور مسلمانوں کی بیخ کنی اور نسل کُشی کے اقدامات کرے گا۔

دورِ غلامی میں ہندوؤں کا مسلمانوں سے رویہ

برطانوی سامراج کے منصوبے بھی ایسے ہی تھے اور عالمی حالات انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے پہلے تین عشروں تک سلطنت برطانیہ کے ہند میں طولِ اقتدار کے حق میں ہی تھے اور دور دور تک مزاحمتی طاقتیں کہیں نظر نہیں آرہی تھیں انگریز حاکم تھا ہندو اور مسلمان دونوں اس کے محکوم۔ تاہم ہندو اپنی ذہنیت کے مطابق مسلمانوں کو اپنے اندر کا ایک حصہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا بلکہ وہ ہمیشہ اسے ایک الگ اکائی ہی سمجھتے رہے یہاں تک کہ ہندو رویہ

بھی بقائے باہمی کے اُصول پر CO-EXISTANCE کی بنیاد بن سکتا تھا مگر ہندو نے مسلمان عوام سے ہمیشہ معاندانہ اور دشمنی کا رویہ ہی اپنایا ہے چنانچہ برطانوی ہند میں بارہا ہندو مسلم فسادات رونما ہوئے جس میں ہندو ہمیشہ جارح بنتا تھا۔ کسی حکومتی فیصلہ سے مسلمانوں کو مفاد ملنے کی توقع ہوتی تو ہندو اپنی عددی اکثریت، انگریز کی کاسہ لیسی اور درپردہ حکمرانوں کی شہ پا کر مسلمانوں کو ان مفادات سے محروم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ بنگال ہو یا سندھ، پنجاب ہو یا بہار ہر جگہ اسی طرح کے رویے دورِ غلامی میں اکثر سامنے آتے رہتے تھے۔ عوامی سطح پر ہندو اپنے عقائد کے مطابق خود زندگی گزارے یا نہ گزارے لیکن مسلمانوں کو اپنے عقائد کے مطابق چلانے کی کوشش کرتا تھا چنانچہ گائے کا ذبیحہ اور مذہبی جلوسوں پر آئے دن کے فسادات ایک معمول کی بات تھی۔

مسلمان عوام کی اجتماعی رائے

اس پس منظر اور ماحول میں مسلمانوں کے ہاں یہ رائے پختہ ہوتی چلی گئی کہ ہندو مسلم نہ صرف الگ اجتماعی اکائیاں یا عرف عام میں قومیں ہیں بلکہ بعض داخلی، خارجی، تاریخی اور مذہبی عوامل کی بنیاد پر بقائے باہمی کے اجتماعی اُصولوں پر اکٹھی رہنے کے کم سے کم تقاضے بھی پورے نہیں کرتیں۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت تھی اور نوشہ دیوار تھا کہ ماضی کے حکمرانوں، تہذیبوں اور خدائی کے دعویداروں کے اقتدار ہمیشہ نہیں رہے بلکہ وقت کے ساتھ ختم ہو گئے تو برطانوی اقتدار اور غلبہ بھی ہمیشہ کے لئے نہیں ہے اور جلد یا بدیر اس 'نحوست' کو بہرحال ختم ہونا ہے اور برطانوی سامراج کا سورج بھی لازماً ایک دن غروب ہوگا اور برطانوی ہند کو اپنے معاملات خود طے کرنے کا حق 'حق خودارادیت' مل کر رہے گا۔

ہندو بھی اس حقیقت سے واقف تھا، اس کے طرزِ عمل اور برطانوی سرکار کے سامنے بچھ جانے کی پالیسی اس کے 'آزادی' کے بعد رویّوں کی نشاندہی کرتے تھے جبکہ مسلمان خواص وعوام کی اکثریت اس بات کی قائل ہوگئی تھی کہ: برطانوی ہند بیسویں صدی کے عالمی تصورات کے تمام اُصولوں کے مطابق ہندو اور مسلمان دو الگ الگ 'قومیں' ہیں۔ ہند کے وسیع علاقے میں مذاہب، زبان، نسل اور جغرافیہ اور تاریخی تسلسل کے اعتبارات سے قومیں تو اور بھی شمار ہوسکتیں تھیں اور اگر مسلمان اس قضیئے میں ایک فریق کے طور پر موجود نہ ہوتے تو مزید کئی 'قومیں' سامنے آجاتیں مگر

مسلم دشمنی میں پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے اس فرمانِ حق نشان کی تصدیق ہوگئی کہ "الکفر ملة واحـدة" [عالم کفر (مسلمانوں کے مقابلے میں) ایک (متحدہ) اکائی یا قوم ہے] اور طویل غور و خوض کے بعد برطانوی ہند میں صرف 'دوقومیں' اور اجتماعی اکائیاں ہی فائنل راؤنڈ کیلئے میدان عمل رہ گئیں۔ (بھارت میں علیحدگی کی جو تحریکیں آج چل رہی ہیں ان کی جڑیں (ROOTS) کئی صدیوں پرانی ہیں اور وہ تقسیم ہند سے پہلے بھی سرگرم عمل تھیں اس بات کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ ہندو نے سکھ مذہب وغیرہ سے مسلمانوں کے علیحدہ قومی تشخص کا توڑ کرنے کے لئے تعاون مانگا ہو۔ جیسے تحریک پاکستان میں مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کا توڑ کرنے کے لئے مسلمانوں کے ایک قابل ذکر اور اہم حصے کو اپنے ساتھ اسی شرط اور یقین دہانی پر ملایا تھا کہ برطانوی سامراج سے گلوخلاصی کے بعد ہم اپنے معاملات آپس میں طے کرلیں گے۔ تاہم زمینی حقائق ایسے تھے کہ ہندو اور دیگر غیر مسلم اقوام کے علاوہ مسلمانوں کے ایک طبقہ کے انڈین نیشنل کانگریس کے نظریات کا ہم نوا بن جانے کے باوجود ـــــــــــــ 'دوقومی نظریہ' نے ڈنکے کی چوٹ اپنا 'حق ہونا' تسلیم کرالیا۔)

مسلم لیگ کے سالانہ اجلاسِ الٰہ آباد (دسمبر 1930ء) میں
علامہ اقبال کا صدارتی خطبہ

اس تناظر میں سب سے زوردار آواز مسلمانوں کی واحد جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے بلند ہوئی۔ علامہ اقبال کی شخصیت عالمی سطح پر جانی پہچانی تھی، اپنی ملی شاعری کی وجہ سے آپ مسلمانوں کے دل کی آواز بن گئے تھے، گزشتہ ربع صدی سے مسلم لیگ اپنے سالانہ اجلاس کرتی آرہی تھی، 1930ء کے سالانہ اجلاس کے لئے جو آلہ آباد میں ہونا تھا مسلم لیگ نے علامہ اقبال سے اس اجلاس کی صدارت کی استدعا کی جو آپ نے قبول کرلی۔ علامہ اقبال چند سال قبل ہی RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM پر خطبات میں دورِ حاضر کی اسلامی ریاست کے خدوخال بیان کر چکے تھے۔ نیز پیام مشرق میں امیر افغانستان امان اللہ خان سے خطاب میں اسلامی ریاست کے نقوش بھی سپرد قلم کر دیے تھے۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی

صدارت کو مناسب موقع سمجھتے ہوئے بڑی مفصل گفتگو کے ذریعے برطانوی سامراج کی واپسی کی صورت میں دوقومی نظریہ کی بنیاد پر الگ ریاست کا تصور پیش فرمایا جہاں مسلمان اپنے ایمان اور اعتقادات کی بنیاد پر قرآن وسنت پر مبنی ریاست کی تشکیل کر سکیں گے۔ آپ نے فرمایا تھا:

''میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو متحد ہو کر ایک واحد ریاست کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں جس کی اپنی حکومت ہو خواہ سلطنت برطانیہ کے تحت یا اس سے الگ۔ اور مجھے نظر آ رہا ہے کہ یہ متحدہ شمال مغربی ریاست کم از کم شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے تقدیر مبرم ہے۔''

برطانوی ہند کے مسلمانوں کا اجتماعی شعور اس بات کا شدت سے تقاضا کرتا تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ انہیں ہندوؤں سے علیحدہ ہو کر ایک خطۂ زمین ملنا چاہئے تا کہ وہ اپنی تہذیب و ثقافت کا تحفظ کر سکیں۔ علامہ اقبال کے صدارتی خطبے نے مسلمانوں کی اس اجتماعی سوچ کو ایک رُخ دے دیا اور دوقومی نظریہ کے ایک مجرّد تصور کو صورت عطا کر دی کہ مسلمانوں کے لئے علیحدہ خطہ زمین.....صرف مسلمان نام کے گورنر، جنرل، صدر، وزیراعظم اور ڈکٹیٹروں کے لئے نہیں بلکہ دراصل یونانی اور عجمی پرانے کائناتی تصورات اور دیومالائی اعتقادات کے زیر اثر تشکیل پائے ہوئے فکر اسلامی (ISLAMIC THOUGHT) کی بجائے نیوٹن کے دور سے بھی آگے آئن سٹائن کے دور کے کائناتی تصورات اور حقیقت اشیاء کے ساتھ ساتھ معاشرتی علوم (SOCIAL SCIENCE) کو قرآن وسنت کی تعلیمات میں سمو کر دورِ حاضر کی ایک جدید فلاحی جمہوری اسلامی ریاست کا نمونہ دنیا کے سامنے رکھ دیا جائے تا کہ 'فلاح' کا خدائی (DIVINE) تصور سامنے آ سکے۔

(قائداعظم) محمد علی جناح کا ''دوقومی نظریہ'' کے بارے میں شدتِ احساس

محمد علی جناح (جو بعد میں تحریک پاکستان کے دوران بجا طور پر مسلمانوں کے قائداعظم مشہور ہوئے) پہلے کانگریس میں تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست داعی (SPOKESMAN)

تھے تاہم مختلف مواقع پر ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے کے بعد وہ ہندوؤں کے اکثریت ہوتے ہوئے بھی رویوں سے بددل ہوکر واپس انگلستان (برطانیہ) چلے گئے تھے ہندوؤں کے بارے میں ان کے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر احساسات یہ تھے کہ 'ہندو ناقابل اصلاح' اور 'ناقابل مفاہمت' قوم ہے جس کے ذریعے عرصے سے برطانوی ہند میں جاری دوقومی نظریہ کی سوچ کو تقویت ملی کہ جب ہندو مسلم اتحاد کے داعی اور سفیر (AMBASSADOR) بھی اس نتیجہ تک پہنچے ہیں تو ــــــــــ ہند کے باشندے واقعی ایک قوم نہیں بلکہ مسلمان اور ہندو دو قومیں ہیں۔

(قائداعظم) محمد علی جناح کی انگلستان سے واپسی

علامہ اقبال حکیم الامت تھے اور ملت کے مسائل پر مسلسل غور وفکر کرتے رہتے تھے وہ عالمی حالات پر بھی گہری نظری رکھتے تھے۔ جب انہوں سے دسمبر 30ء کے صدارتی خطبہ میں مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا تو ملک کے طول وعرض سے مسلم زعماء کو یہ احساس دامن گیر ہوا کہ علیحدہ وطن کا تصور تو برحق ہے اور ''دوقومی نظریہ'' کا منطقی تقاضا ہے نیز عالمی حالات میں نظام عدل اجتماعی کے عملی نمونے اور اسلام کے نظام خلافت کی 'جہانگیری' یعنی GLOBAL تصور کی عملی تشکیل کے لئے پہلا قدم بھی ــــــــــ لیکن اس مطالبے کو لے کر کون اُٹھے گا؟

اس لئے کہ مسلم لیگ میں اس وقت تک کوئی معروف مسلم لیڈر نہیں تھا سر آغا خان سوئم عرصے سے مسلم لیگ کے صدر تھے اور ان سے کسی انقلابی اقدام کی توقع نہیں تھی۔

مزید برآں ــــــــــ برطانوی سامراج کی خوش فہمی کہ مسلم لیگ کو بے ضرر جماعت سمجھتے ہوئے اس کی صدارت کو آغا خان سوئم کی صلاحیتوں کا ضیاع تصور کیا اور انہیں کسی دوسرے برطانوی مشن کی تکمیل کے لئے تاج برطانیہ کی ہند کے بارے میں سب سے اعلیٰ مشاورتی فورم پریوی کونسل (PREVY COUNCIL) کا ممبر بنادیا، مسلم لیگ کی صدارت اور رہنمائی کے لئے تلاش شروع ہوئی تو علامہ اقبال کی 'شاہینی نگاہ' (قائداعظم) محمد علی جناح پر مرکوز ہوگئی ان کی پروقار شخصیت بے داغ کردار، پورے ہند میں ان کی مقتدر حلقوں میں نیک نامی جیسے اوصاف کی مالک اس ہستی کو انگلستان سے واپس لاکر مسلم لیگ کی صدارت پر آمادہ کرنے میں علامہ اقبال کا بنیادی کردار ہے۔ اس دوران ملاقاتوں اور مختلف مواقع پر خطوط کے ذریعے

مسلمانوں کے شاندار ماضی، حال اور روشن مستقبل کے بارے میں قرآن وحدیث کے دلائل عصر حاضر کے خیالات اور شاعری میں دیا گیا اپنا پیغام بھی اُن کو پہنچایا۔

ہندو کی تنگ نظری کے ذاتی تجربات رکھنے والا یہ شخص جو کبھی 'ہندو مسلم اتحاد کا سفیر' کہلاتا تھا جب مسلم لیگ کی صدارت سنبھال کر ''صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق'' قسم کی ملت اسلامیہ ہند کو انڈین نیشنل کانگریس کے مقابلے میں صف آرا کرنے میں کامیاب ہوا ہے تو دنیا حیران رہ گئی اور 'دوقومی نظریہ' کے مطابق مسلمانوں کے مقابلے کی 'دوسری قوم' دلیل و برہان کی طاقت کے سامنے بے دست و پا ہو کر رہ گئی۔

23 مارچ 1940ء قرارداد پاکستان کی منظوری

1939ء: قائداعظم نے 8/اپریل کی مسلم لیگ کونسل سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''اس وقت کئی منصوبے اور تجاویز ہمارے سامنے ہیں، جن میں ملک کو تقسیم کرنا بھی شامل ہے۔ یہ مسئلہ ورکنگ کمیٹی کے زیر غور ہے۔ پورے مسئلے کا جائزہ لیا جائے گا اور ایسی سکیم پیش کی جائے گی جو ورکنگ کمیٹی کے نزدیک مسلمانانِ ہند کے بہترین مفاد میں ہوگی۔''

1940ء: فروری کے پہلے ہفتے میں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی اور کونسل کے اجلاس دہلی میں منعقد ہوئے جن میں مسلمانانِ ہند کے لئے علیحدہ وطن پر سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ فیصلہ ہوا کہ اس کی باقاعدہ تجویز مارچ میں ہونے والے سالانہ اجلاس لاہور میں پیش کی جائے۔

1940ء: 6 فروری کو قائداعظم نے وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو سے ملاقات کی اور بتا دیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ اپنے لاہور والے کھلے اجلاس میں ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کرنے والی ہے۔

1940ء: 22/مارچ، منٹو پارک لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کے ستائیسویں اجلاس کا پہلا دن۔ ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں نے ''قائداعظم زندہ باد'' کے والہانہ نعروں سے اپنے قائد کا استقبال کیا۔ تلاوتِ قرآن مجید کے بعد چند نظمیں پڑھی گئیں، جن میں میاں بشیر احمد کی نظم ''ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح'' بے حد پسند کی گئی۔ مجلس استقبالیہ کے صدر نواب سر شاہ نواز خان ممدوٹ نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ قائداعظم نے اپنی طویل اور پر اثر تقریر میں مسلمانانِ ہند کے مسائل پر روشنی ڈالی اور دوقومی نظریے کی انتہائی مدلل اور منطقی انداز میں وضاحت کی۔ آج کا اجلاس بخیر و

خوبی ختم ہوا۔ رات کو مجلس موضوعات کی میٹنگ میں اس تاریخ ساز قرارداد کے متن پر غور وخوض کیا گیا جو کل 23/مارچ کو جلسۂ عام میں فیصلے کے لئے پیش کی جائے گی۔

1940ء: 23 مارچ: آج ہفتہ ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا کھلا اجلاس تین بجے قائداعظم کی زیر صدارت شروع ہوا۔ نواب زادہ لیاقت علی خان نے مسلم لیگ کی سالانہ رپورٹ پڑھی۔ جب بنگال کے وزیراعلیٰ فضل حق ڈائس پر تشریف لائے تو فضا تالیوں اور ''شیرِ بنگال زندہ باد'' کے نعروں سے گونج اُٹھی۔ وہ تاریخ ساز، پاکستان ساز قرارداد پیش کرنے کا سہرا شیرِ بنگال ہی کے سر بندھا۔ آپ نے قرارداد جو انگریزی میں تھی، پڑھ کر سنائی۔ یہاں اس قرارداد کا وہ ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو ''مینارِ پاکستان'' پر کندہ ہے۔ یہ ترجمہ پیش کرنے کی سعادت راقم السطور (سید قاسم محمود) کا حاصل ہے۔ اس کی نظر ثانی سید وقار عظیم صاحب نے کی تھی اور مترجم کو داد دی تھی کہ وہ ایک شوشے کی بھی کمی بیشی نہیں کر سکے۔ یہ ترجمہ ''مینار'' کے معمار اعظم جناب مختار مسعود کی نگرانی میں مینار کے چبوترے کا مستقل حصہ ہوا۔ قرارداد کا متن یہ ہے:

(1) آئینی مسئلے پر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور مجلس عاملہ کے اس اقدام کی تائید و توثیق کرتے ہوئے جو ان کی 27 اگست، 17، 18 ستمبر، 22 اکتوبر 1939ء اور 3 فروری 1940ء کی قراردادوں سے واضح ہوتا ہے، آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس پرزور اعادہ کرتا ہے کہ وہ وفاقی منصوبہ جس کا اظہار گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء میں کیا گیا ہے، قطعاً غیر موزوں، اس ملک کے خاص حالات کے پیش نظر ناقابلِ عمل اور مسلم ہندوستان کے لئے یکسر ناقابلِ قبول ہے۔''

(2) اس اجلاس کی یہ حتمی رائے ہے کہ 18/اکتوبر 1939ء کو جو اعلان وائسرائے نے حکومت ملک معظم کی جانب سے کیا تھا وہ اس حد تک تو اطمینان بخش ہے کہ جس مسلک اور منصوبے پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء پر مبنی ہے، اس پر ہندوستان کی مختلف جماعتوں، مفادات اور فرقوں کے مشورے سے دوبارہ غور کرنے کا یقین دلایا گیا ہے، لیکن مسلم ہندوستان اس وقت تک مطمئن نہیں ہوگا، جب تک کہ پورے آئینی منصوبے پر از سرِ نو غور نہ کیا جائے، کوئی نیا منصوبہ مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہوگا،

تاوقتیکہ اُن کی رضامندی اور منظوری سے مرتب نہ کیا جائے۔

(3) قرار پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی یہ مسلّمہ رائے ہے کہ کوئی آئینی منصوبہ اس ملک میں قابل عمل اور مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہوگا، تاوقتیکہ وہ مندرجہ ذیل اُصول پر وضع نہ کیا گیا ہو، یعنی جغرافیائی طور پر متصل وحدتوں کی حد بندی ایسے خطوں میں کی جائے (مناسب علاقائی ردّ و بدل کے ساتھ) کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، مثلاً ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی حصے، ان کی تشکیل ایسی آزاد ریاستوں کی صورت میں کی جائے جن کی مشمولہ وحدتیں خودمختار اور مقتدر ہوں۔

نیز ان وحدتوں اور خطوں میں اقلیتوں کے مذہبی، معاشی، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کا مناسب، مؤثر اور حکمی تحفظ ان کے مشورے سے آئین میں صراحت کے ساتھ کیا جائے۔ مزید برآں یہ اجلاس مجلس عاملہ کو اختیار دیتا ہے کہ وہ ان بنیادی اُصولوں کے مطابق آئین کا ایک ایسا منصوبہ تیار کریں، جس کی رُو سے مذکورہ علاقوں کو بالآخر کُلی اختیارات حاصل ہو جائیں مثلاً دفاع، اُمور خارجہ مواصلات، محصولات اور دیگر ایسے اُمور جو ضروری سمجھے جائیں۔''

مولوی فضل الحق (بنگال)، چوہدری خلیق الزماں (یوپی)، مولانا ظفر علی خان (پنجاب)، اورنگ زیب خان (صوبہ سرحد) حاجی سر عبداللہ ہارون (سندھ) نواب اسماعیل (یوپی)، قاضی محمد عیسیٰ (بلوچستان)، عبدالحمید خان (مدراس)، ابراہیم اسماعیل چندریگر (بمبئی) سید عبدالرؤف شاہ (سی پی) ڈاکٹر محمد عالم (پنجاب) بیگم مولانا محمد علی جوہر (یوپی) مولانا عبدالحامد بدایوانی، سید ذاکر علی اور بہت سے اکابر ملت نے اس قرارداد کے حق میں مدلل اور پرجوش تقریریں کیں۔ ان بیانات کے بعد اجلاس کے صدر قائداعظم نے قرارداد پر عمومی رائے طلب کی اور زبردست تالیوں کی گونج میں قرارداد متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔

حصہ سوم

دوقومی نظریہ
تحریک پاکستان اور نظریۂ پاکستان

- ☆ مسلمانوں کی بیداری اور صف بندی
- ☆ دوسری جنگ عظیم 1939ء۔1945ء
- ☆ تحریک پاکستان.....اسلامی ریاست اور نظریۂ پاکستان
- ☆ دوقومی نظریہ کا OUTWARD LOOKING پہلو
- ☆ دوقومی نظریہ کا INWARD LOOKING پہلو
- ☆ قراردادِ مقاصد

دوقومی نظریہ،تحریک پاکستان اورنظریۂ پاکستان

مسلمانوں کی بیداری اورصف بندی

حصہ اوّل میں یہ بات تفصیل کے ساتھ آ چکی ہے کہ مسلمان اور ہندو کبھی اپنے آپ کو ایک قوم تصور نہیں کرتے تھے یہ صرف ہندو کی خواہش تھی کہ مسلمانوں کو بھی ہند میں سابقہ فاتحین کی طرح دوستی کی آڑ میں گلے لگا کر ان کا علیحدہ تشخص ختم کر دیا جائے۔ یورپی استعمار بھی مذہب کو دبانا چاہتا تھا اور امور سلطنت کو سیکولر بنیادوں پر چلانا چاہتا تھا اور عالمی مافیا یہود کا منصوبہ بھی یہی تھا کہ مذہب ریاست کی سطح پر دخیل نہ ہو۔ ان حالات میں برطانوی سامراج کی سرپرستی میں 'ہند' کے تمام لوگوں میں ایک 'قوم' کے فلسفے کو آگے بڑھایا گیا۔ مگر مسلم زعماء کی بیدار مغزی کے ساتھ بعض داخلی اور خارجی عوامل نے ہندو کی اس بد باطنی اور یہود کی برطانوی سامراج کی آڑ میں اس چال کو بے اثر کر دیا۔

1930ء کے خطبہ آلہ آباد میں علامہ اقبال کی طرف سے علیحدہ وطن کی تجویز سے برطانوی ہند کے مسلمانوں کی اجتماعی اُمنگ اور آرزو کو ایک پیکر مل گیا۔ اس سے تقسیم ہند کے فارمولے کے حامیوں میں اضافہ ہو گیا اور عوامی تائید بھی مل گئی۔ چوہدری رحمت علی اور دیگر دردمند مسلمانوں نے تقسیم کے ذریعے مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کے مطالبے کو عملی شکل دینے کے لئے کام کیا ہے۔ چوہدری رحمت علی نے مسلمانوں کے اس مطلوبہ وطن کا نام پاکستان تجویز کیا اور اس کا نقشہ بھی شائع کرنے کا اہتمام کر دیا۔ یہ تصورات بیک وقت برطانوی ہند اور برطانیہ میں پھیل رہے تھے بلکہ برطانوی ہند سے تعلق رکھنے والے مسلمان دنیا بھر میں جہاں جہاں تھے وہ دامے درمے سخنے اس میں دلچسپی لینے لگے تھے۔

دوقومی نظریہ نے پہلے ایک علیحدہ وطن پاکستان کی کے مطالبہ شکل اختیار کی اور 23

مارچ 1940ء کو لاہور میں قرارداد پاکستان منظور ہوگئی (لاہور میں اسی تاریخی واقعہ کی یاد میں اس مقام پر مینارِ پاکستان تعمیر کیا گیا ہے) اس قرارداد کو مسلمانوں سے زیادہ شدت کے ساتھ 'دوقومی نظریہ' کی رو سے دوسری قوم نے ہوا دی اور اسے قرارداد پاکستان کا نام دے دیا جو مسلمانوں کو اپنے دل کی آواز محسوس ہوئی اور یہ اصطلاح تھوڑے ہی عرصے میں برطانوی ہند کے طول وعرض میں زبان زدعام ہوگئی۔

علامہ اقبال کے کلام نے ہند کے مسلمانوں کو 'شکوہ'، 'جوابِ شکوہ'، 'طلوعِ اسلام'، ''مسجد قرطبہ' جیسی نظموں کے ذریعے خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا تھا اور غلام قوم کے 'تن مردہ' میں جیسے یکا یک جان پیدا ہوگئی ہو۔ قرارداد پاکستان کے منظور ہوتے ہی تعلیم یافتہ مسلمانوں نے گویا اس مطالبے کے لئے مسلم لیگ کا بے لوث کارکن بن کر اپنی اپنی جگہ پر کام شروع کر دیا اور برطانوی ہند کے طول وعرض میں ہر چہار طرف مسلمانوں میں مسلم لیگ کا چرچا عام ہوگیا اور مسلم لیگ کا سبز پرچم ہر جگہ نظر آنے لگا۔ علامہ اقبال نے اگرچہ بہت پہلے یہ کہہ دیا تھا کہ

؎ آنکھ جو دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اور..... ؎ شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

تاہم (قائداعظم) محمد علی جناح کی قیادت میں مسلم لیگ کے دوبارہ بحال ہونے کے بعد اقبال کے شہر لاہور میں قرارداد پاکستان کی منظوری کے باوجود ــــــــــــ بظاہر حالات ایسے نہیں تھے کہ اس مطالبے کو جلد پذیرائی مل جائے اور مسلم لیگ کی برپا کردہ تحریک پاکستان کامیابی سے ہم کنار ہو جائے۔ دنیا کی تاریخ میں 'آزادی' کا حصول ایک طویل اور صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے تاہم انہیں سالوں میں جرمنی اور برطانیہ کے مابین 1939ء میں جنگ چھڑ گئی جس میں جرمنی کے اتحادیوں اور برطانوی اتحادیوں کی شرکت کی وجہ سے یہ جنگ عالمی جنگ میں بدل گئی۔ اس جنگ کے برطانوی ہند کے مسلمانوں پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

دوسری جنگ عظیم 1939ء۔1945ء

پہلی جنگ عظیم 1914ء۔1918ء میں اگرچہ برطانیہ نے جرمنی کو شکست سے دوچار کر دیا تھا اور جنگ کے بعد جرمنی اور اس کے اتحادیوں کو خاصی ذلت اُٹھانی پڑی اور ترکی جو کہ پہلے سلطنت عثمانیہ تھی، مشرق وسطی سمیت اپنے بہت سارے مقبوضات سے ہاتھ دھو بیٹھا اور صرف 'جمہوریہ ترکی' باقی رہ گیا۔ جہاں خلافت کے خاتمے کا اعلان کر کے جمہوریت نافذ کر دی گئی۔

اس کے باوجود 1918ء کے بعد جرمنی نے تیزی سے اپنے جنگی نقصانات اور اس کے اثرات سے عہدہ برآ ہو کر 1933ء میں ہٹلر کی سربراہی میں دوبارہ منظّم ہونا شروع کر دیا اور بہت جلد عالمی سطح پر دوسری جنگ کا آغاز ہو گیا۔

یہ جنگ عالمی سطح پر تھی جاپان نے جرمنی کا ساتھ دیا برطانیہ اپنے اتحادیوں سمیت جرمنی کے مقابلے میں نقصانات اٹھا رہا تھا اور جرمنوں کا پلڑا بھاری رہا تھا۔ عالمی منصوبہ ساز اور در پردہ صہیونی لابی جو اپنے مذموم مقاصد کے لئے تاج برطانیہ کی حفاظت کرتی چلی آ رہی تھی اس نے جرمنوں کی فتح کو اپنے لئے موت سمجھا۔ اس لئے کہ ہٹلر کو یہودی سازشوں اور صہیونی لابی کے انسان دشمن اور ابلیسی منصوبوں کا علم ہو گیا تھا اور اس نے بقول یہود 50/60 لاکھ یہودیوں کو کیمپوں میں قتل کرا دیا اسے یہود "HAULO CAUST" کہتے ہیں۔ لہٰذا، امریکہ بہادر جو بظاہر اس جنگ سے بہت دور تھا اور اسے کسی قسم کا جنگی حملوں کا خطرہ بھی نہیں تھا' اس نے یہودی لابی اور صہیونی طاقت کے ایما پر جنگ میں یکا یک کود پڑنے کے لئے خود ہی پرل ہاربر (نیویارک) پر نائن الیون کی طرح کا مصنوعی حملہ کر دیا جس سے امریکہ کو عالمی جنگ میں کودنے کا موقع مل گیا اور مزید برآں اس جنگ میں جاپان اور جرمنی کا پلڑا بھاری ہوتا دیکھ کر برطانیہ کو بچانے کی خاطر امریکہ نے جاپان کے شہروں، ہیروشیما اور ناگاساکی پر 1945ء میں ایٹم بم گرا دیا جس سے بے تحاشا تباہی پھیل گئی دونوں شہر تباہ ہو گئے اور یوں برطانیہ امریکہ جیت گئے جبکہ جرمنی اور جاپان شکست سے دوچار ہو گئے۔

آغاز سے ہی برطانیہ نقصانات اُٹھا رہا تھا اور اس کے عالمی مقبوضات کا کنٹرول ان جنگی نقصانات کی وجہ سے کمزور پڑ رہا ہے۔ برطانیہ کے کمزوری اور جنگی بوکھلاہٹ کا نتیجہ یہ نکلا کہ

1) برطانوی ہند میں 1935ء سے لوکل گورنمنٹ ایکٹ کے ذریعے صوبائی اور مرکزی

اسمبلی کے انتخابات سے مقامی حکومتیں بنائی گئیں تھیں وہ ابھی ابتدائی مراحل ہی میں تھیں کہ 1939ء میں جنگ عظیم کے چھڑ جانے کا بہانہ بنا کر برطانیہ نے ہند میں ایمرجنسی نافذ کر دی اسمبلیاں توڑ دی گئیں اور اختیارات براہِ راست تاجِ برطانیہ کے ہاتھ میں چلے گئے۔ ان اقدامات سے برطانیہ کی کمزوری اور جنگی خوف کا اندازہ کرنا مشکل نہ تھا۔

2) 1937ء کے الیکشن میں کانگریس ہی زیادہ کامیاب ہوئی تھی تاہم اسمبلیوں کے ختم ہونے سے جہاں کانگریس کو دھچکا لگا اور ہندو منصوبوں کو زک پہنچی وہاں مسلم لیگ کو اپنی صفیں اگلے الیکشن کے لئے منظّم کرنے کا مناسب موقع مل گیا۔

3) قرارداد پاکستان کے ذریعے علیحدہ وطن کا مطالبہ ایک طویل جدوجہد کا متقاضی تھا..... تاہم جنگی نقصانات اور برطانوی بوکھلاہٹ، امریکہ کا جنگ میں بلاوجہ کود پڑنا ایسے اقدامات تھے جس سے برطانوی ہند کے مسلمانوں کو برطانوی سامراج کا بستر گول ہوتا نظر آیا اور آزادی کی منزل قریب آتی دکھائی دی۔

تحریک پاکستان.....اسلامی ریاست اور نظریۂ پاکستان

برطانوی سامراج کے ضعف اور جنگی نقصانات کے باعث ہند پر اس کی گرفت کمزور ہوگئی تو.....ایک طرف ہندوؤں نے پاکستان کے قیام کی مخالفت میں شدت پیدا کر دی اور ہندو پریس اور ہندو تنظیمیں اپنے مشن میں سرگرم عمل ہوگئیں۔ دوسری طرف قیام پاکستان کی منزل قریب دیکھ کر مسلمانوں میں خوشی اور کامرانی کی لہر دوڑ گئی کارکنوں میں نیا جذبہ پیدا ہوگیا۔ جدید تعلیمی اداروں میں ہر جوان اس جذبے سے سرشار مسلم لیگ کا کارکن اور پاکستان کا سپاہی بن گیا۔ عوامی بیداری کی ایک لہر اُٹھی اور خانقاہوں کے سجادہ نشین اور گدی نشین غیبی اشارے پا کر یکا یک اکٹھے ہوگئے اور قیام پاکستان کی مہم میں اپنے مریدین، معتقدین اور وابستگان سمیت شریک ہو گئے۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ اور علماء کی ایک جماعت اگرچہ کانگریس کا ساتھ دے رہی تھی تاہم مسلم عوام اور سوادِ اعظم مسلم لیگ کے جھنڈے تلے آ گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ کانگریس کے ساتھ تعاون کرنے والے حلقہ دیوبند کا ایک اہم حصہ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی قیادت میں وہاں سے علیحدگی اختیار کر کے مسلم لیگ سے آملا تھا۔

ان حالات میں مسلم لیگ کی قیادت کو اسلامی ریاست کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ جذبات میں تحریک چلانا ایک بات ہے اور تحریک کی کامیابی کی صورت قیام پاکستان کے بعد ملک کو سنبھالنا اور اس کے تقاضے پورے کرنا .....اہم ذمہ داری، کٹھن کام اور بے لوث حکومتی مشینری کا متقاضی تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اس صورت حال میں سب سے اہم کام یہ کیا کہ اسلامی ریاست کے بارے میں اپنی پالیسی اور نظریات کو نہایت دیانت داری سے وضاحت اور ڈنکے کی چوٹ بیان کرنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں نے ماضی میں ہزار سال دنیا کے متمدن حصے پر حکومت کی تھی اس کی روایات ان کے سامنے تھیں۔ تاہم چند صدیاں قبل کی ریاست اور اس کے امور اور بیسویں صدی کی ریاست اور اس کے امور میں خارجی حالات کی تبدیلی کی وجہ سے بے انتہا فرق تھا جو کہ سب کے سامنے تھا۔

چنانچہ علامہ اقبال کی شاعری کا لُبِ لباب، دسمبر 1930ء کے ان کے خطبہ صدارت کا مفہوم، ابلیس کی مجلس شوریٰ میں ابلیسی اور صہیونی منصوبوں کے تانے بانے کی موجودگی میں اور قرآن و حدیث کی روشنی میں جلد ہی پاکستان کا نظریہ ـــــ اسلام ـــــ قرار پایا اور عوامی سطح پر ..... پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ.....کا نعرہ زبان زد عام ہو گیا۔ قائداعظم محمد علی جناح کا ایک خطاب جو اُنہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن کے طلبہ کے سامنے کیا تھا۔ اس میں واشگاف الفاظ میں فرمایا:

> ''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تکمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے، نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لیے آپ کو علاقہ اور مملکت (پاکستان) کی ضرورت ہے۔''

پاکستان کا نظریہ اسلام قرار پایا۔ مطلب .....لا الٰہ الا اللہ.....، قرآن (و حدیث)

رہنما اور سپریم قانون قرار پائے۔ اس مملکت اسلامی کے لئے دورحاضر میں ایک آئین کی ضرورت تھی یہ آئین تو یقیناً مملکت وجود میں آنے پر اس کی اسمبلی کو ہی منظور کرنا تھا۔ تاہم قائداعظم محمد علی جناح نے اس ضمن اپنا موقف اور نقطہ نظر از حد واضح سامنے رکھا تھا تا کہ کسی کو ابہام نہ رہے۔ ان کے نزدیک قرآن مجید (آخری آسمانی کتاب) ہمارا آئین ہے۔

گویا ــــــــــــ مستقبل کی ریاست ایک اسلامی نظریاتی ..... ریاست طے پا گئی جس کا نظریہ اسلام اور آئین قرآن ہوگا اور نظام حکومت نظام خلافت ہوگا۔

قرارداد پاکستان میں برطانوی ہند کے مسلمانوں کے لئے دوقومی نظریے کی بنیاد پر تجویز کردہ جس علیحدہ وطن کی بات کی گئی تھی اس مملکت کا نام پاکستان عوام کے دل کی آواز تھا اور اس میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ اس مملکت پاکستان کو ایک اسلامی نظریاتی مملکت قرار دیا گیا، یہ الفاظ بھی مسلمانوں کی امنگوں کے ترجمان تھے اور اس پر بھی گویا اتفاق رائے تھا اور اس سلسلے میں کوئی آواز قیام پاکستان سے پہلے اس کے خلاف نہیں اُٹھی۔

گویا ــــــــــــ برطانوی ہند کے مسلمانوں کے مسائل اور برطانوی غلامی کے عذاب سے نجات کے لئے جو بحث چھ سات عشرے چل کر دوقومی نظریے پر اتفاق رائے کی صورت میں منتج ہوئی تھی اور اب ہندوؤں اور مسلمانوں میں اس پر آمنا سامنا تھا مرکزی سطح پر کانگریس اور مسلم لیگ میں مذاکرات ہو رہے تھے اور برطانوی سامراج سے مطالبات منوائے جا رہے تھے مسلمانوں کے نزدیک اس 'دوقومی نظریے' کے دو پہلو تھے:

☆ ایک پہلو OUTWARD LOOKING

☆ دوسرا پہلو INWARD LOOKING

دوقومی نظریہ کا OUTWARD LOOKING پہلو

برطانوی ہند میں ایک طویل عرصے کے تجربات کے بعد مسلمانوں کو اس بات کا یقین تھا اور اعلیٰ علمی حلقوں میں برملا تذکرہ ہوتا تھا کہ مسلمان اور ہندو دو علیحدہ معاشرتی اکائیاں ہیں اور برملا 'دو علیحدہ قومیں' ہیں جن کے مذہبی معاملات اور معاشرتی رویے ہی علیحدہ ہیں لہٰذا برطانوی سامراج کی واپسی کی صورت میں یہ دونوں 'قومیں' اکٹھی نہیں رہ سکیں گی۔ یہ دوقومی نظریہ اعلیٰ علمی حلقوں اور

تعلیمیافتہ مسلمانوں کے دلوں کی آواز بن گیا تھا تاہم یہ بات عوامی سطح پر اتنی واضح نہیں تھی۔

قائداعظم محمد علی جناح نے جب مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی ہے تو انہیں ابتدائی سالوں میں قرارداد پاکستان کی منظوری تک (بلکہ اس کے بعد بھی بعض موقعوں پر) اس دوقومی نظریہ کی وکالت دو مختلف انداز میں کرنا پڑی ہے۔ اس میں پہلا انداز وہ ہے جسے ہم یہاں OUTWARD LOOKING کا نام دے رہے ہیں وہ انداز یہ تھا کہ غیر مسلموں، انگریزوں اور ہندوؤں سے بات کرتے ہوئے دوقومی نظریہ کے جو پہلو زیر بحث لائے جاتے تھے یا جو دلائل دیے جاتے تھے وہ یہ تھے کہ غیر مسلموں اور مسلمانوں کے اعتقادات، ایمانیات، عبادات، طرز بود وباش، حلال وحرام، کھانے پینے کے طریقے، قانون، ثقافت، سماجی اور معاشرتی رویے، معاشی اور سیاسی نظریات سب کچھ مختلف ہے متضاد ہے علیحدہ ہے؛ لہٰذا ــــــــــــ یہاں برطانوی ہند میں دوقومیں ہیں اور یہ ایک حقیقت تھی جس کا بیان نہ صرف مسلمان بلکہ منصف مزاج غیر مسلم (پارسی، یورپی اور دیگر دانشور) بھی برملا کرتے تھے۔ یہی دلائل بعض اوقات ان جدید مغرب زدہ یا ہندوؤں کے زیر اثر مسلمانوں کے سامنے بھی رکھنے پڑتے ہیں جو بوجوہ اس صورت کو ابھی تک سمجھ نہیں رہے تھے یا 'ہضم' نہیں کر پا رہے تھے۔

دوقومی نظریہ کا INWARD LOOKING پہلو

اسی دور میں دیگر مسلم زعماء اور قائداعظم محمد علی جناح کو جب ایسے مسلمانوں سے گفتگو کرنا پڑتی تھی یا انہیں خطاب کرتے تھے جو دوقومی نظریہ کے قائل اور مسلم لیگ کے ساتھ تھے تو صاف ظاہر ہے کہ ان کے سامنے اس قضیئے اور مسئلے کے وہ پہلو بیان ہوتے تھے جو مسلمانوں سے متعلق ہیں۔ مسلمانوں کے دینی تقاضے، قرآن وحدیث کی طرف سے ذمہ داریاں، ایک سچے مسلمان کا کردار، اسلام کا نفاذ، شریعت کی عملداری، اسلامی حکومت، مسلمانوں پر اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے پہلو سے دینی تقاضے ــــــــــــ یہ وہ پہلو تھے جو مسلمانوں کے اجتماعات سے خطاب کرتے ہوئے بیان کرنا پڑتے تھے۔ صرف یہ نہیں کہ ہندوؤں سے ہمارا مذہب، رہن سہن، حلال حرام الگ ہے لیکن ہم پھر بھی اکٹھے رہیں گے اور سارے معاملات الگ رکھیں گے۔ دوقومی نظریہ کا یہ پہلو مسلمانوں کے لئے حد درجہ اہم تھا کہ ہمارے دین اور ایمان کا تقاضا ہے کہ اس دور

میں بھی ایک اسلامی نظریاتی ریاست قائم کر کے دکھائیں اور دنیا کو اسلام کی دعوت دیں اور اگر یہ مثالی اسلامی جمہوری فلاحی ریاست قائم کر کے دکھا سکیں تو کوئی وجہ نہیں کہ حضرت محمد ﷺ کے لائے ہوئے دین پر ساری دنیا کے لوگ 'لبیک' نہ کہیں ــــــــــــ اس لیے کہ یہی دین فطرت ہے اور ہر معقول اور باضمیر انسان کے دل کی آواز ہے۔ ہمارا دین اسلام صرف دنیا کے مذاہب کی فہرست میں ایک اضافہ نہیں ہے بلکہ حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر تھے اور ان کا دین ہی اب قیامت تک دین ہے جبکہ سابقہ دین اپنے اپنے وقت پر VALID تھے ان کے پیغمبروں علیہم السلام نے بھی یہی کہا تھا کہ بعد میں جو پیغمبر آئیں گے ان پر ایمان لانا ــــــــــــ مگر نسلی و فرقہ وارانہ تعصب اور جماعتی برتری کے احساس کی شدت کی وجہ سے سابقہ انبیاء کی امتیں حضرت محمد ﷺ پر ایمان نہیں لائیں ــــــــــــ اسلام کی اس تشریح کے تحت مسلمانانِ عالم (بالخصوص مسلمانانِ ہند) کی ماضی کی روایات اور علمی ورثہ کی وجہ سے یہ لازمی اور کٹھن ذمہ داری ہے کہ وہ اس موقع پر جب انہیں علیحدہ وطن مل رہا ہے اس کو دور حاضر کی مثالی اسلامی جمہوری فلاحی ریاست بنا کر دکھا دیں۔ یہ دلائل اور انداز گفتگو بعض قارئین و ناقدین کو OUTWARD LOOKING کے انداز سے متضاد نظر آتا ہے تو وہ مخمصے کا شکار ہو جاتے ہیں اور اسے نقطہ نظر کا تضاد گردانتے ہیں۔

قائداعظم محمد علی جناح کے ابتدائی سالوں کے خطابات اور بیانات میں بعض اوقات یہ دونوں پہلو بیک وقت موجود ہوتے ہیں اور حاضرین اور مدعوئین کی مناسبت سے یہی مناسب اور ضروری تھا۔

ذیل میں ہم چند اقتباسات پیش کر رہے ہیں جن سے مدّعا کو واضح کرنے میں مزید آسانی پیدا ہو گئی ہے۔

☆ OUTWARD LOOKING ASPECTS

1۔ ہندو مسلم سمجھوتہ ہندوستان میں کوئی نیا دستور نافذ کرنے سے پہلے کا ایک ضروری ناگزیر اقدام ہے۔ (گول میز کانفرنس 1931ء)

2۔ ہندوؤ اور انگریزو! تم دونوں متحد ہو کر بھی ہماری روح کو فنا کرنے میں کبھی کامیاب

نہیں ہوسکو گے۔تم اس اسلامی تہذیب کو کبھی نہیں مٹا سکو گے جو ہمیں ورثہ میں ملی ہے۔ ہمارا نور ایمان زندہ ہے زندہ رہا ہے اور زندہ رہے گا۔(مرکزی اسمبلی 22 مارچ 1939ء)

3۔ ہندو اور انگریز نے سمجھا کہ مسلمان محض ایک اقلیت ہیں جن پر ہندو اکثریت کو حکومت کرنا چاہئے اور اِدھر مسلمان ایک جھوٹے احساسِ سلامتی میں مسلسل مبتلائے فریب رہے اور اقلیت کی اصطلاح کو تاریخی، آئینی اور قانونی سمجھا جانے لگا۔لیکن مسلمان کسی صورت میں بھی ویسی اقلیت نہیں ہیں جیسی یورپی ملکوں میں ہوتی ہیں۔ایک چیز قطعی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم کسی اعتبار سے اقلیت نہیں ہیں بلکہ ہم اپنے نصب العین کے ساتھ بجائے خود ایک علیحدہ اور ممتاز قوم ہیں۔ (مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔6 مارچ 1940)

4۔ اسلام اور ہندو دھرم محض مذاہب نہیں بلکہ درحقیقت وہ دو مختلف معاشرتی نظام ہیں۔ چنانچہ اس خواہش کو خواب وخیال ہی کہنا چاہئے کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک مشترکہ قومیت تخلیق کر سکیں گے۔

یہ لوگ آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے نہ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں۔ میں واشگاف لفظوں میں کہتا ہوں کہ وہ دو مختلف تہذیبوں سے واسطہ رکھتے ہیں اور ان تہذیبوں کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے جو ایک دوسرے کی نہ صرف ضد ہیں بلکہ اکثر متصادم ہوتے رہتے ہیں۔انسانی زندگی کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیالات اور تصورات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی ترقی کی تمناؤں کے لئے مختلف تاریخوں سے نسبت رکھتے ہیں۔ان کے تاریخی ماخذ مختلف ہیں، ان کی رزمیہ نظمیں، ان کے سربرآوردہ بزرگ اور قابل فخر تاریخی کارنامے سب مختلف اور الگ الگ ہیں۔اکثر اوقات ایک قوم کا زعیم اور رہنما دوسری قوم کی بزرگ اور برتر ہستیوں کا دشمن ثابت ہوتا ہے۔ایک قوم کی فتح دوسری قوم کی شکست ہوتی ہے۔ایسی دو قوموں کو ایک ریاست اور ایک حکومت کی ایک مشترکہ گاڑی کے دو بیل بنانے اور ان کی باہمی تعاون کے ساتھ قدم بڑھانے پر آمادہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں کے دلوں میں بے صبری روز بروز بڑھتی رہے گی جو انجام کار تباہی لائے گی خاص کر اس صورت میں کہ ان میں سے ایک قوم تعداد کے لحاظ سے اقلیت میں ہو اور دوسری اکثریت حاصل ہو؛

ایسی ریاست کے آئین کا عمل خاک میں مل کر رہے گا۔(اجلاس مسلم لیگ لاہور۔23مارچ1940)

5۔ قومیت کی تعریف چاہے جس طرح کی جائے،مسلمان اس تعریف کی رو سے ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس لئے اس بات کے مستحق ہیں کہ ملک میں ان کی اپنی الگ مملکت اور اپنی جداگانہ خودمختار ریاست ہو۔ہم مسلمان چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے اندر ایک آزاد قوم بن کر اپنے ہمسایوں کے ساتھ ہم آہنگی، امن اور سلامتی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ ہماری تمنا ہے کہ ہماری قوم اپنی روحانی، اخلاقی، تمدنی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کو کامل ترین نشوونما بخشے اور اس کام کے لئے وہ طریق عمل اختیار کرے جو اس کے نزدیک بہترین ہو اور اپنے نصب العین سے ہم آہنگ ہو۔(اجلاس مسلم لیگ، لاہور 23 مارچ 1940ء)

6۔ مسلم اقلیتوں کو غلط باور کرایا گیا ہے کہ ہندوستان میں کسی تجویز، تقسیم یا علیحدگی سے وہ گھاٹے میں رہیں گے اور بے سہارا چھوڑ دیئے جائیں گے۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ایک متحدہ ہندوستان میں یا ایک مرکزی حکومت کے تحت مسلمان جہاں بھی اقلیت میں ہوں اپنے موقف کو بہتر بنا سکتے ہیں۔خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، وہ محض اقلیت ہی رہیں گے۔البتہ وہ ایسے تمام تحفظات کا بجا طور پر مطالبہ کر سکتے ہیں جو کسی مہذب حکومت میں رائج ہوں۔لیکن تقسیم ہند کے سنگ راہ بن کر وہ اپنے موقف کو بہتر نہیں بنائیں گے اور نہ بنا سکتے ہیں۔اس کے برعکس وہ اپنی مخالفانہ روش سے اس اسلامی وطن اور اس کے چھ کروڑ مسلمانوں کو ایسی حکومت کے تحت لا سکتے ہیں جہاں یہ ایک دوامی اقلیت سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوں گے۔(اخباری بیان مارچ 1940ء)

7۔ ہم نے قطعی طور پر اور ہمیشہ کے لئے پاکستان کو اپنی منزل مقصود بنا لیا ہے ہم اس کے لئے لڑنے مرنے کو تیار ہیں۔(مرکزی اسمبلی 19 نومبر 1940ء)

8۔ ہندوؤں کو چاہیے کہ وہ ہندو راج کے خواب دیکھنا چھوڑ دیں اور ہندوستان کو مسلم ہندوستان اور ہندو ہندوستان میں تقسیم کرنے پر راضی ہو جائیں۔(مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن دہلی نومبر 1940ء)

9۔ میں پاکستان کے لئے لڑ رہا ہوں کیونکہ ہمارے مسائل کا یہی ایک عملی حل ہے۔ ہندوستان نہ تو ایک ملک ہے اور نہ ہی ایک قوم۔(میمن چیمبر آف کامرس بمبئی 27 مارچ 1947ء)

INWARD LOOKING ASPECTS ☆

1۔ وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسد واحد کی طرح ہو گئے۔ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اُمت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟ وہ رشتہ وہ چٹان وہ لنگر خدا کی کتاب قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا ہوتا جائے گا۔ ایک خدا، ایک رسولؐ، ایک کتاب، ایک اُمت۔ (اجلاس مسلم لیگ کراچی 1934ء)

2۔ ہم نے پاکستان حاصل کر لیا ہے لیکن یہ تو محض آغاز ہے۔ اب بڑی بڑی ذمہ داریاں ہمارے کاندھوں پر آن پڑی ہیں اور جتنی بڑی ذمہ داریاں ہیں اتنا ہی بڑا ارادہ اور اتنی ہی عظیم جدوجہد کا جذبہ ہم میں پیدا ہونا چاہئے۔ آزاد اور خودمختار پاکستان کی پہلی عید جوان شاءاللہ خوشحالی کا ایک نیا باب کھولے گی اور جو اسلامی ثقافت ونظریات کی نشاۃِ ثانیہ کی تحریک کا ایک اہم سنگ میل ثابت ہوگی۔ میں دعا کرتا ہوں کہ وہ ہم سب کو ہماری گزشتہ اور قابل احترام تاریخ کے شایانِ شان بنائے اور ہمیں یہ توفیق عطا کرے کہ ہم اپنے پیارے پاکستان کو صحیح معنوں میں عظیم ملک بنائیں۔ (پیغامِ عید 18 اگست 1947ء)

3۔ اسلامی تعلیمات کی درخشندہ روایات وادبیات کس امر پر شاہد ہیں؟ دنیا کی کوئی قوم جمہوریت میں مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو اپنے مذہب میں بھی جمہوری نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ (اجلاس مسلم لیگ لکھنؤ 31 دسمبر 1916ء)

4۔ اسلام انصاف، مساوات، معقولیت اور رواداری کا حامل ہے، بلکہ جو غیر مسلم ہماری حفاظت میں آ جائیں، ان کے ساتھ فیاضی کو بھی روا رکھتا ہے۔ (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ 2 نومبر 1940ء)

5۔ قرآن مجید مسلمانوں کا ہمہ گیر ضابطہ حیات ہے۔ مذہبی، سماجی، شہری، کاروباری، فوجی، عدالتی، تعزیری اور قانونی ضابطہ حیات جو مذہبی تقریبات سے لے کر روزمرہ زندگی کے معاملات تک، روح کی نجات سے لے کر جسم کی صحت تک، تمام افراد سے لے کر ایک فرد کے حقوق تک، اخلاق سے لے کر جرم تک، اس دنیا میں جزا اور سزا سے لے کر اگلے جہاں تک کی سزا وجزا تک کی حد بندی کرتا ہے۔ (پیامِ عید 1945ء)

6۔ اگر ہم قرآن مجید کو اپنا آخری اور قطعی رہبر بنا کر شیوۂ صبر و رضا پر کاربند ہوں اور اس ارشادِ خداوندی کو کبھی فراموش نہ کریں کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، تو ہمیں دنیا کی کوئی ایک طاقت یا کئی طاقتیں مل کر بھی مغلوب نہیں کر سکتیں؛ ہم فتح یاب ہوں گے، اسی طرح جس طرح مٹھی بھر مسلمانوں نے ایران اور روم کی سلطنتوں کے تختے اُلٹ دیئے تھے۔ (جلسہ عام حیدرآباد دکن 11 جولائی 1946ء)

7۔ میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس اُسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے، جو ہمیں قانون عطا کرنیوالے پیغمبر اسلام ﷺ نے ہمارے لئے بنانا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اُصولوں پر رکھیں۔ (شاہی دربار سبی بلوچستان 14 فروری 1947ء)

8۔ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ زمینداروں اور سرمایہ داروں کو متنبہ کر دوں۔ اس طبقے کی خوشحالی کی قیمت عوام نے ادا کی ہے۔ کیا آپ نے سوچا کہ کروڑوں لوگوں کا استحصال کیا گیا ہے اور اب ان کے لئے دن میں ایک بار کھانا حاصل کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔ اگر پاکستان کا حصول اس صورت حال میں تبدیلی نہیں لاسکتا تو پھر اسے حاصل نہ کرنا ہی بہتر سمجھتا ہوں۔ اگر وہ (سرمایہ دار اور زمیندار) عقل مند ہیں تو اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق ڈھال لیں گے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو پھر خدا ان کے حال پر رحم کرے ہم ان کی مدد نہیں کریں گے۔ (اجلاس مسلم لیگ دہلی 24 مارچ 1943ء)

9- GOD HAS GIVEN US AN OPPORTUNITY TO BE THE ARCHITECTS OF A NEW NATION. LET IT NOT BE SAID THAT WE DID NOT PROVE EQUAL TO THE TASK.

اوپر درج دو قومی نظریہ کے INWARD LOOKING ASPECTS اور OUT WARD LOOKING ASPECTS کی تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ 'دو قومی نظریہ' کے برملا اظہار و بیان نے 1930ء سے لے کر 1940ء تک علیحدہ وطن پاکستان کے مطالبہ کی شکل اختیار کی تھی اور 1940ء سے 1947ء تک نظریہ پاکستان یعنی مطلوبہ علیحدہ وطن

مسلمانوں کی ایک اسلامی نظریاتی مملکت ہوگی اور یہی تحریک پاکستان کے سفر کا حاصل ہے کہ پاکستان کے اس اسلامی اور نظریاتی ریاست کے تشخص ہی کا دوسرا نام نظریہ پاکستان ہے۔

گویا 3 جون 1947ء کے اعلان تقسیم کے بعد سے جو سفر شروع ہوا وہ اس نظریہ پاکستان کے مطابق دور حاضر کی ایک جدید اسلامی جمہوری فلاحی ریاست کے وجود میں آنے کا سفر ہے جو یقیناً اقوام عالم کے لئے ایک ایسی مثالی ریاست بھی ہوگی جس کو دنیا آگے بڑھ کر اپنا لے ــــــــــ اور یہی دنیا کا مقدر بھی ہے اور نوشتہ دیوار بھی۔ اس مثالی ریاست کے قیام اور اس کی جہانگیری (GLOBALISATION) سے پہلے END OF HISTOTY کا تصور کسی انسان دشمن، مفاد پرست اور ظالم طبقہ کی خواہش یا دیوانے کی بڑ تو ہوسکتی ہے انسانیت کا نصیب اور مقدر نہیں ہوسکتا۔

نظریہ پاکستان.....آئینی الفاظ میں

قرارداد مقاصد

(جسے دستور ساز اسمبلی پاکستان نے 12 مارچ 1949ء کو منظور کیا)

چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کل کائنات کا بلاشرکتِ غیر حاکم مطلق ہے اور اسی نے جمہور کی وساطت سے مملکت پاکستان کو اختیار حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لئے نیابتاً عطا فرمایا ہے اور چونکہ یہ اختیار حکمرانی ایک مقدس امانت ہے۔

لہٰذا جمہور پاکستان کی نمائندہ یہ مجلس دستور ساز فیصلہ کرتی ہے کہ آزاد وخود مختار مملکت پاکستان کے لئے ایک دستور مرتب کیا جائے۔

☆ جس کی رو سے مملکت جملہ حقوق واختیارات حکمرانی جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعہ سے استعمال کرے۔

☆ جس میں اُصولِ جمہوریت وحریت ومساوات ورواداری اور عدل عمرانی کو، جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے، پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے۔

☆ جس کی رو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات ومقتضیات کے مطابق جو قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ میں متعین ہیں ترتیب دے سکیں۔

☆ جس کی رو سے اس امر کا قرار واقعی انتظام کیا جائے کہ اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے مذہبوں پر عقیدہ رکھ سکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں۔

☆ جس کی رو سے وہ علاقے جواب پاکستان میں داخل ہیں یا شامل ہو گئے ہیں اور ایسے دیگر علاقے جو آئندہ پاکستان میں داخل یا شامل ہو جائیں' ایک وفاقیہ بنائیں جس کے ارکان مقرر کردہ حدود اربعہ ومتعینہ اختیارات کے ماتحت خود مختار ہوں۔

☆ جس کی رو سے بنیادی حقوق کی ضمانت کی جائے اور ان حقوق میں قانون اور اخلاق عامہ کے ماتحت مساوات حیثیت ومواقع قانون کی نظر میں برابری، عمرانی، اقتصادی اور سیاسی عدل، خیال، اظہار، عقیدہ، دین، عبادت اور ارتباط کی آزادی شامل ہوں۔

☆ جس کی رو سے اقلیتوں اور پس ماندہ وپست طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کا قرار واقعی انتظام کیا جائے۔

☆ جس کی رو سے نظامِ عدل کی آزادی کامل طور پر محفوظ ہو۔

جس کی رو سے وفاقیہ کے علاقوں کی صیانت اس کی آزادی اور اس کے جملہ حقوق کا جن میں اس بر و بحر اور فضا پر سیادت کے حقوق شامل ہیں تحفظ کیا جائے۔

☆ تا کہ اہل پاکستان فلاح وخوشحالی کی زندگی بسر کر سکیں۔ اقوام عالم کی صف میں اپنا جائز اور ممتاز مقام حاصل کر سکیں اور امن عالم کے قیام اور بنی نوع انسان کی ترقی و بہبود میں کما حقہٗ اضافہ کر سکیں۔

حصہ چہارم

پاکستان.....اسلامی نظریاتی ریاست

- ☆ انفرادی اور اجتماعی زندگی
- ☆ اسلامی ریاست پاکستان کی پہلی صبح
- ☆ خلافت راشدہ اور تمدنی وعمرانی ارتقاء
- ☆ دور حاضر کی اسلامی ریاست
- ☆ قیام پاکستان.....نظریاتی فلاحی مملکت کے 65 قمری سال
- ☆ نظریاتی اسلامی ریاست کے ستون
- ☆ ریاست اور نظام تعلیم
- ☆ دو قسم کی ریاستیں ـــــ دو قسم کے نظام تعلیم
- ☆ نظریاتی ریاست
- ☆ غیر نظریاتی ریاست
- ☆ غیر نظریاتی یا سیکولر ریاستیں
- ☆ نظریاتی ریاستیں(IDEALOGICAL STATES)

پاکستان.....اسلامی نظریاتی ریاست

انفرادی اور اجتماعی زندگی

خالق کائنات نے اپنی اس تخلیق میں دیدہ زیب مناظر کی رنگارنگی اور نظریات وافکار کی خوشبو رکھی ہے انسانی نفسیات میں مختلف میلانات، خیالات اور جذبات کے علاوہ عادات واطوار کی بوقلمونی (VARIETY) بھی ہمارے خمیر میں شامل ہے۔ اپنی شناخت کے لئے نام، ذات، قبیلہ اور قوم کے تصورات ناگزیر انسانی ضرورت ہے اور ہر انسان میں یہ نظریات بچپن اور لڑکپن کی غیر شعوری عمر میں ہی پختہ ہو جاتے ہیں۔ پھر معاشرت، معیشت اور اجتماعیت کے ضابطے بھی انسانی زندگی کے لئے ہوا اور پانی کی طرح ناگزیر ہونے کی وجہ سے فاطر فطرت نے ہمارے شعور اور وجدان کا حصہ بنا دیے ہیں نیز تحقیق وجستجو کا رجحان اس میدان میں بہتر سے بہترین کی طرف ایک مسلسل سفر کے لئے مہمیز بنتا ہے۔ ضمیر انسانی اگر زندہ ہے تو یہ سفر 'چلنا چلنا مدام چلنا' کی صورت میں ہر دم رواں دواں رہتا ہے اسی حرکت اور تغیر کا دوسرا نام ہی حقیقی زندگی ہے اس سفر میں کوتاہی پر انسان کا اپنا ضمیر ہی اُسے کوستا رہتا ہے اور ہر باضمیر انسان کے لئے 'تازیانے' کا کام کرتا ہے۔

حیات انسانی کے اس سفر میں انسان نے زندگی کے ہر گوشے میں بے انتہا ترقی کی ہے۔ رہن سہن، لباس، زراعت، رہائش، آبادیاں، معاشرہ، استعمال کی ضروری اشیاء، سفر وحضر کے لوازمات غرض ہر شعبے میں آج انسان بقول علامہ اقبال ''عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں'' کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔

یہ انسانی زندگی انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ ابتدائے سفر میں انفرادی زندگی کا

دائرہ وسیع تھا اور اجتماعیت کا مختصر۔ جیسے جیسے انسان نے تجرباتی علوم اور اس کے نتیجے میں سہولتیں ایجاد کر لی ہیں اور معاشرتی علوم (SOCIAL SCIENCES) کا سبق پڑھ لیا ہے اور آگے بڑھتا جا رہا ہے فرد انسانی کی انفرادیت کا دائرہ محدود اور اجتماعیت اور اس کے سخت ضابطوں کا شکنجہ (HOLD) مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے۔

آج بھی ایک 'مرد صحرائی' یا 'مرد کوہستانی' کا تصور کیجیے۔ وہ بجلی کی لوڈ شیڈنگ، سوئی گیس کی بندش، ماحولیاتی آلودگی، ماحولیاتی شور، گندگی، خوراک اور پانی میں آلودگی اور ملاوٹ کے مسائل، سفر کی پریشانیوں، اوورلوڈنگ، کرایوں کی زیادتی، پٹرول اور گیس بلز کی ادائیگی جیسے عصری مسائل اور پریشانیوں سے آزاد کھلی فضاؤں میں فطرت کے قریب قدرتی صاف ستھری تازہ غذائیں کھا کر صحت مند ہے اور اپنے ضمیر اور دل کی آواز کے مطابق خدا پرستی اور خدا شناسی کی زندگی گزار رہا ہے۔ اُسے آئے دن کے حکومتی فیصلے متاثر نہیں کرتے اُسے حکومتوں اور حکومتی شخصیات کی تبدیلی کی خبر بھی بہت دیر میں ہوتی ہے انفرادی زندگی کا دائرہ وسیع ہے۔ جبکہ آج کے متمدن شہروں میں انفرادیت برائے نام رہ گئی ہے کراچی جیسے شہر میں سوئی گیس دو دن کے لئے مکمل طور پر بند کر دی جائے تو لوگوں کو ایک وقت کی روٹی نہیں مل سکتی شاید لوگ لڑ بھڑ کر مر جائیں۔

لہٰذا ــــــــــــ انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی میں ایک قابل عمل توازن ہی فلاح انسانی کا ضامن ہے۔ دنیا نے برادری کے سرپنچ، قبیلوں کے سردار، قومی رہنماء، راجے مہاراجے، حکمران، بادشاہ، شہنشاہ اور خدائی کے دعویدار مطلق العنان ظالم حکمرانوں کے تجربات کیے ہیں اور اس کا حاصل تاریخ میں محفوظ ہے۔

حیات انسانی کے اسی سفر میں خالق کائنات نے انسانی رہنمائی کے لئے آسمانی ہدایت دے کر پیغمبر مبعوث فرمائے جنہوں نے انسانی افکار اور طرز عمل کو سدھارنے اور راہ راست پر لانے کی کوششیں کیں ہیں۔ انسانی معاشروں کے بگاڑ کے بعد جب بھی اصلاح کا مرحلہ آیا ہے تاریخ انسانی پہلے بھی اور آج بھی گواہ ہے کہ اُس میں بالواسطہ یا بلاواسطہ اس آسمانی وحی اور پیغمبرانہ تعلیمات کو بنیادی دخل رہا ہے۔ انہیں برگزیدہ ہستیوں میں اللہ تعالیٰ نے تمدنی ارتقاء کے عروج پر حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا ہے جنہیں قرآن مجید عطا ہوا جو ــــــــــــ اب رہتی دنیا تک

انسانیت کے لئے نسخہ کیمیا اور کتاب ہدایت ہے۔ خلافت راشدہ سے لے کر اب تک اُسی کی روشنی میں انسانیت کا سفر جاری ہے۔ بقول علامہ اقبال

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
زاں کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہا ست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

مسلمان تو اپنے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے فرامین اور لائی ہوئی ہدایت کو انسانی فلاح کا پیغام ہی سمجھتے ہیں۔ جو قومیں حضرت محمد کو ذاتی تعصب یا نادانی میں پیغمبر نہیں مانتیں اور مثالی جمہوری فلاحی ریاست کے قیام کے لئے تجربات کر رہی ہیں یقیناً وہ بھی اپنے تجربات کے ذریعے (BY HIT AND TRIAL) اسلامی تعلیمات کی طرف ہی پیش قدمی کر رہی ہیں۔

بادشاہت، جمہوریت اور ڈکٹیٹروں کے طرزِ حکمرانی کے برعکس حضرت محمد ﷺ کا عطا کردہ اسلام کا طرز حکمرانی منفرد ہے جس میں انسانی انفرادیت اور اجتماعیت کو انسانی فطرت کے عین مطابق نہایت متناسب انداز میں سمو دیا گیا ہے۔ انسان کو آئین قرآن (وحدیث) کا پابند بنا کر آزادی کا ایک وسیع میدان مہیا کر دیا گیا ہے تاکہ وہ اپنی آزادی کے احساس اور خودارادیت کے حق کے تحت اپنے اللہ کو راضی کر سکے اور اللہ کے رسول ﷺ کے نقش قدم پر چل کر اپنے ضمیر میں سکون اور اطمینان پائے نیز موت کے بعد کی زندگی میں دائمی آرام۔

جب تک اجتماعی زندگی کسی معقول، انسان دوست، خداشناس اور فلاحی سوچ کی بنیادوں پر استوار نہ کی جائے انسان کی انفرادی زندگی بھی حقیقی انسانی زندگی نہیں ہو سکتی لہٰذا ــــــــــ انفرادی زندگی کو مکمل طور پر اپنے مذہب اور نظریات کے مطابق ڈھالنے کے لئے اجتماعی زندگی کا اسی رُخ پر تعمیر کرنا ضروری ہے۔ قومی زندگی میں اجتماعی زندگی کو اپنے مذہب کے مطابق ڈھالنے کے لئے جو قربانیاں دی جاتی ہیں جو کوششیں ہوتی ہیں اور جو بھی 'جہاد' ہوتا ہے وہ 'جدوجہدِ آزادی' کہلاتی ہے کسی قوم کا اپنی مخالف اور مزاحم قوتوں سے نبرد آزما ہو کر اپنے طے کردہ پروگرام اور خود اختیار کردہ راستے پر چلنے کے عزم پر ڈٹ جانا اور مرنے مارنے پر تیار ہو جانا

ہی زندہ قوموں کا شیوہ ہے اور حق ارادیت کہلاتا ہے۔ 'جہادِ زندگانی' کے اس سفر میں ہم مسلمانوں کے لیے یقین محکم، عمل پیہم اور اپنے محسن و آقا حضرت محمد ﷺ کی محبت و عشق ہی بنیادی سرمایہ ہیں اور اس سفر کا زادِ راہ ہے۔ اس جدوجہد میں کامیابی ہی ''آزادی'' کی اصل صبح ہے۔

اسلامی ریاست پاکستان کی پہلی صبح

14/اگست 1947ء کو برطانوی ہند کے مسلمانوں کو دو صدیوں کی غلامی کے بعد ـــــ آزادی ـــــ اور حقیقی آزادی مل رہی تھی۔ برطانوی ہند میں مسلمانوں کے علیحدہ معاشرتی تشخص کو دو قومی نظریہ کے ذریعے منوا کر ـــــــــــ مسلمان نظریہ پاکستان کے تحت ایک اسلامی ریاست کے قیام کی شاہراہ پر قدم رکھ رہے تھے اس وقت مسلم قیادت کے خیالات کیا تھے؟

1 ''میرے خیال میں ہندو مسلم مسئلہ کا تقسیم کے سوا اور کوئی حل تھا ہی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل کی تاریخ کا فیصلہ بھی اسی کے حق میں ہوگا اور اس سے زیادہ یہ کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا عملی تجربہ سے یہ بات واضح ہوتی جائے گی کہ ہندوستان کے آئینی مسئلہ کا حل سوائے تقسیم کے اور کچھ نہیں تھا۔ متحدہ ہندوستان کا تخیل ہرگز قابلِ عمل نہ ہوتا، اور میری رائے میں وہ ہمیں زبردست تباہی کی طرف لے جاتا۔'' (خطبہ صدارت مجلس دستور ساز۔ 11 اگست 1947ء)

2 ''ہندوستان تقسیم ہو چکا ہے۔ اسے تقسیم ہونا ہی تھا۔ یہ تقسیم قطعی اور ناقابل تنسیخ ہے۔'' (اخباری بیان۔ 14 اگست 1947ء)

3 ''دنیا کی کوئی طاقت پاکستان کا شیرازہ بکھیرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ پاکستان کی جڑیں مضبوطی اور گہرائی کے ساتھ قائم کر دی گئی ہیں۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ تو نے ہی یہ آزاد و خود مختار سلطنت ہمیں عطا کی ہے، تو ہی یہاں کے باشندوں کو مصائب و آلام برداشت کرنے کی ہمت دے اور صبر و استقلال عطا فرمایا اور انہیں صلاحیت بھی دے کہ ہر قسم کے اشتعال کے باوجود پاکستان کی خاطر اس کے امن و امان کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہیں۔''

(اخباری بیان۔ 24 اگست 1947ء)

4 ''پاکستان کو معرضِ وجود میں لانا مقصود بالذات نہیں بلکہ کسی مقصد کے حصول کے ذریعے کا درجہ رکھتا ہے۔ ہمارا نصب العین یہ تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت کی تخلیق کریں جہاں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں، جو ہماری تہذیب وتمدن کی روشنی میں پھلے پھولے اور جہاں معاشرتی انصاف کے اسلامی تصور کو پوری طرح پنپنے کا موقع ملے۔'' (حکومتِ پاکستان کے افسران سے خطاب۔ 11 اکتوبر 1947ء)

5 ''ہم نے پاکستان کا مطالبہ اس لئے کیا تھا، اس کی خاطر اس لئے جدوجہد کی تھی، اسے اس لئے حاصل کیا تھا کہ ہم اپنی روایات کے مطابق اپنے معاملات کو حل کرنے میں جسمانی اور روحانی نقطۂ نظر سے مکمل طور پر آزاد ہوں۔ اُخوت، مساوات اور رواداری، یہ ہمارے مذہب، تہذیب اور تمدن کے بنیادی نکات ہیں۔ ہم نے ان عظیم تصورات کے لئے جدوجہد کی اسی لئے پاکستان اور اس کی جدوجہد کی کہانی عظیم انسانی خیالات وتصورات کو عملی جامہ پہنانے کی داستان ہے۔''
(جلسۂ عام چٹاگانگ۔ 26 مارچ 1948ء)

6 ''اسلامی اقدار کو اپنانا انسانی ترقی کی معراج پر پہنچنے کے لئے ناگزیر ہے۔ یہ ایک طرف قیام پاکستان کا جواز ہیں اور دوسری طرف ایک مثالی معاشرے کی تخلیق کی ذمہ دار ہیں۔ آج جبکہ ہماری اجتماعی روح اونچ نیچ کی تمام زنجیروں کو توڑ چکی ہے، ہمیں چاہیے کہ آگے بڑھیں اور نہ صرف اپنی ریاست بلکہ اپنی قوم کے ہر شعبے اور ہر پہلو کو صیقل کر دیں۔'' (جلسۂ عام چٹاگانگ۔ 26 مارچ 1948ء)

7 ''پاکستان کے سامنے ایک بڑا شاندار مستقبل ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ قدرت نے ہمیں جن فیاضیوں سے نوازا ہے ان سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور ایک مضبوط وشاندار پاکستان کی تعمیر کریں۔''

(جلسۂ عام، ڈھاکہ۔ 28 مارچ 1948ء)

خلافت راشدہ اور تمدنی وعمرانی ارتقاء

پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی تشریف آوری صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں تھی بلکہ

وہ رحمت للعالمین ﷺ بن کر آئے تھے اور ان کی تعلیمات دنیا بھر کے تمام انسانوں کے لئے فلاحِ دارین کی ضامن تھیں اور آج بھی ہیں۔ آپ ﷺ سے پہلے آنے والے تمام پیغمبر علیہم السلام بھی بہت ہی قابل احترام ہیں وہ سب نبوت و وحی کے سلسلہ الذہب کی کڑیاں ہیں اس سنہری سلسلہ ہدایت و رشد کو تسلیم کرنے کا تقاضا ہے کہ سابقہ پیغمبران علیہم السلام کے ماننے والے اسی سلسلہ کی آخری کڑی خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ پر ایمان لائیں ورنہ ان کا اللہ پر ایمان، وحی پر ایمان اور پیغمبروں پر ایمان 'اُصولی' نہیں رہے گا بلکہ ہدایت کو صرف اپنے تک محدود رکھنے کی وجہ سے تعصب اور جانبداری کا حامل قرار پائے گا۔

انسانی زندگی اور اس کے تقاضے غیر متبدل ہیں۔ آسمانی ہدایت اور اُصولی طور پر تمام پیغمبروں کی تعلیمات بھی ایک ہی تھیں۔ تاہم انسانی زندگی میں وقت کے ساتھ ساتھ تجرباتی علوم میں جو بے پناہ ترقی ہوئی ہے وہ سب کے سامنے ہے اور درجہ بدرجہ انسانی تجرباتی علوم آگے بڑھے ہیں۔ لہٰذا ــــــــــ آسمانی وحی میں تفصیلی ہدایات اور تقاضے بھی بدلتے رہے ہیں۔ انسان ابتداء میں لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا لہٰذا ابتدائی وحی اور احکام پیغمبروں کے ذریعے زبانی طور پر پہنچائے گئے، انسانی تمدن آگے بڑھا انسان نے لکھنا سیکھنا تو لکھی ہوئی ہدایات عطا ہوئیں حتیٰ کہ انسان نے کاغذ ایجاد کر لیا تو 'صحیفے' اور زُبُر عطا ہوئے۔ انسان نے کتابیں بنالیں تو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو کتابیں عطا فرمائیں کہ یہ انسانوں کے لئے آسمانی ہدایت کو (وصول کرنے کے لئے) آسان، (عملاً) محفوظ، (ریفرنس کے لئے) دیرپا اور بعد کی نسلوں کے استفادہ کے لئے بھی قابل استناد عمل ہے۔

اسی طرح زراعت، ٹیکنالوجی، سفر، رہن سہن اور طرز بود و باش کے علاوہ اجتماعی اداروں میں انسانی تمدن نے بتدریج قبائل سے معاشرے، شہری آبادیاں، حکومتیں، بادشاہتیں اور ــــــــــ آئینی حکومتوں اور نظریاتی ریاستوں تک کا سفر کیا ہے؛ لہٰذا سابقہ ادوار میں تشریف لانے والے انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات اپنے دور کے ظروف و احوال (CIRCUMSTANCES) کے مطابق ہی تھیں تبھی قابل عمل بھی تھیں۔ تا آنکہ آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ تشریف لائے جن کا زمانہ جدید زمانہ کا آغاز ہے اور ان پر قرآن مجید نازل ہوا جو

اب قیامت تک کے لئے ہدایت ہے ان اُصولوں پر انسان خود غور وفکر اور خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ختم نبوت کے ذریعے قرآن مجید کی اُصولی ہدایت اور حضرت محمد ﷺ کے جامع اُسوہ حسنہ کے بعد انسانی صلاحیتوں پر بھرپور اعتماد کیا ہے کہ وہ اب ان اُصولوں کی روشنی میں تا قیامت غور وفکر اور مشورے کے ذریعے اپنے لئے تفصیلی احکام مرتب کر لے گا۔ ختم نبوت کے ذریعے انسانی صلاحیتوں کا اعتراف ہے انسانی امانت دیانت اور رویوں پر اس اعتماد سے عظمت انسانی میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے کہ انسان صرف حیوان ہی نہیں خالق ارض وسما کا خلیفہ اور نائب بھی ہے۔

پہلی اسلامی ریاست 01ھ سے لے کر 11ھ میں حضرت محمد ﷺ کے وصال تک مختلف مراحل سے کامیابی سے گزر کر کامل ترین شکل میں وجود میں آ چکی تھی اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دور ہے جو خلافت راشدہ ہے اور اُصولی طور پر ایک منفرد حیثیت کی حامل ہے کہ یہ حضرات خلفاء اربعہ اور ان کے ہزاروں ساتھیوں نے حضرت محمد ﷺ کا زمانہ پایا تھا اُن کے ساتھ وقت گزارا تھا اُن سے عملی تربیت لی تھی اور لسانِ حق ترجمان، اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی طرف سے بشارتیں حاصل کی تھیں۔ آپ کا وصال اس حال میں ہوا کہ آپ مجموعی طور پر جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم سے خوش اور راضی تھے۔ اس حقیقت کا تذکرہ قرآن مجید میں اُصولی طور پر ہے۔ اور آپ نے وصال سے قبل اس کا اظہار فرما کر عملی طور پر اس پر مہر تصدیق بھی ثبت کر دی۔ چونکہ اب قیامت تک ایسی جماعت کا وجود محال ہے لہٰذا.....اس جماعت کے ذریعے قائم ہونے والا نظام اور اسلامی ریاست کا نمونہ بھی بعد میں آنے والی نسلوں اور ریاستوں کے لئے عملی نمونہ اور IDEAL کی حیثیت رکھتا ہے۔

بیسویں صدی کی اسلامی ریاست کی تشکیل کے مرحلہ پر ہمارے لئے قرآن مجید کتاب ہدایت ہے اس کتاب کے معلم ومفسر 'سراپا قرآن' اور اُسوہ کامل حضرت محمد ﷺ کی ذات اقدس ہے اور خلافت راشدہ کے نظائر ہیں۔

حضرت محمد ﷺ اللہ کے پیغمبر ہی نہیں آخری پیغمبر تھے آپ نبی بھی تھے رسول بھی تھے آپ ﷺ کی ذاتی خصوصیات ایسی ہیں کہ وہ دوسرے انسان تو کیا انبیاء کرام علیہم السلام کے برگزیدہ

گروہ کے افراد کو یکجا عطا نہیں ہوئیں۔ آپ کا 'دور خلافت' 'منفرد' مقام کا حامل ہے آپ پر 'وحی' آتی تھی اور آپ کا طرز عمل آسمانی ہدایت کے مطابق تھا اور..... ''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى'' [اور وہ خواہش (نفس) سے بات نہیں کرتے، یہ (قران) تو حکم الٰہی ہے جو (ان کی طرف) بھیجا جاتا ہے۔(52-4-5)] عملاً آپ ''كان خلقه القرآن'' کا نمونہ تھے اور ''اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ'' کا مظہر۔ آپ کا اتباع انسان کے لئے کس حد تک ممکن اور قابل عمل ہے اس کی مثال صحابہ کرام ﷺ نے پیش کر دی اور ان سے میں سے بھی وہ خوش نصیب ہیں جو فتح مکہ میں حاضر تھے جو صلح حدیبیہ کی بیعت میں حاضر تھے جو اُحد میں موجود تھے جو بدر کے موقع پر ہم رکاب تھے جو مہاجرین کے زمرہ میں شامل ہیں جو السابقون الاوّلون شمار کیے جاتے ہیں اور..... جو عشرہ مبشرہ کا مژدہ جانفزا پا گئے..... جو خلفائے راشدین کے مقام ارفع تک پہنچے اور پھر ترتیب خلافت میں درجات پر فائز ہیں۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام ﷺ کو بھی آخرت کی کامیابی کے حصول کے لئے ''ما انا عليه و اصحابی'' کا راستہ دکھایا، گویا جماعت صحابہ ﷺ میں بھی 'اصحابی' وہ ہیں جو آپ ﷺ کے قریب تر ہیں۔ یعنی اے جماعت صحابہ ﷺ (تم دیکھ رہے ہو) جو جتنا مجھ سے قرب رکھتا ہے وہ اتنا ہی ہدایت میں کامل اور دوسروں کے لئے ہدایت کا مینار اور نمونہ ہے۔

اُمتی ہونے کی حیثیت آج ہمارے لئے اسلامی ریاست کا نمونہ خلافت راشدہ ہے کہ آپ ﷺ کے تربیت یافتہ اور معتمد ساتھیوں نے آپ کے پیغام کو کیا سمجھا..... کیسا سمجھا؟ اور اس پر عمل کیسے کیا؟ اور کس چیز کو مقدم کیا اور کس چیز کو موخر کیا؟

تاہم خلافت راشدہ کے بعد انسانی تجربات (تمدنی ارتقاء) کی چودہ صدیاں بیت چکی ہیں اور افراط و تفریط کو نظر انداز کر دیں تو بھی متوازن انسانی سوچ نے تجربات کے ذریعے بہت سی حقیقتوں کو پا لیا ہے لہٰذا ان تجرباتی حقیقتوں کا ادراک ضروری ہے اور ان کو آج کی اسلامی ریاست کے تصور میں سمونا ــــــــــ تقاضائے عقل و فطرت ہی نہیں تقاضائے دین بھی ہے۔

تلاش حقیقت کے اس سفر میں چند اہم اُمور درج ذیل ہیں:

(1) ریاست اور حکومت دو علیحدہ چیزیں ہیں حکومت کا مخالف لازماً ریاست کا مخالف نہیں ہے۔

(2) ریاست کے اُمور کی نگرانی کے لئے ایک آئین منظور کیا جائے گا جو ریاست کے اندر

آئین ساز اسمبلی کے نام سے عوامی چناؤ کے ذریعے وجود میں آنے والی اسمبلی تیار کرے گی۔

(3) ملک کا نظام صدارتی یا پارلیمانی ہوسکتا ہے

(i) پارلیمانی نظام میں صدر آئین کا محافظ اور ریاست کے تحفظ کا ذمہ دار ہوتا ہے جبکہ وزیراعظم انتظامی سربراہ حکومت۔

(ii) صدارتی نظام میں ملک کا نظام صدر چلاتا ہے اور ریاست کے تحفظ کی ذمہ داری ایوان بالا پر ہوتی ہے۔

(4) ریاست متعدد صوبوں پر بھی مشتمل ہوسکتی ہے اور وحدنی نظام بھی ہوسکتا ہے۔

(5) انتظامیہ، مقنّنہ اور عدلیہ ریاست کے تین اہم ستون ہیں۔

(6) انتظامیہ یعنی حکومت عوام کے نمائندوں پر مشتمل ہوگی ان نمائندوں میں سے ہی اکثریت کا اعتماد حاصل کرنے والا انتظامیہ کا سربراہ بنے گا۔

(7) مقنّنہ.....ریاست کا قانون ساز ادارہ ہوگا عوامی چناؤ سے معین مدت کے لئے بنے گا مدت کے اختتام پر نئے انتخابات ہوں گے۔ آئین میں ترمیم کا اختیار بھی مقنّنہ کو ہوتا ہے۔

(8) عدلیہ دو اُمور سرانجام دے گی

(i) آئین میں درج بنیادی حقوق عوام کو میسر ہیں یا نہیں، ان کی نگہداشت۔

(ii) آئین کا تحفظ اور تمام ریاستی اداروں کا آئینی حدود میں رہ اپنے اُمور سرانجام دینے کی نگہداشت۔

(9) صدر/ وزیراعظم کے غلط طرز عمل پر آئین میں درج طریق کار کے مطابق مواخذہ ہوسکتا ہے یا ہٹایا جاسکتا ہے۔

(10) صدر ملک میں مخدوش حالات میں ایمرجنسی نافذ کرسکتا ہے جس سے عوام کے بنیادی حقوق معطل ہو جائیں گے۔ صدر اسمبلی کو تحلیل بھی کرسکتا ہے۔ ملکی حالات کی خرابی یا بدانتظامی پر اسمبلی تحلیل کر کے وسط مدتی انتخابات بھی کرائے جاسکتے ہیں۔

(11) اسلامی ریاست میں علماء کا کردار بہت اہم ہے وہ براہ راست منتخب ہو کر بھی مقنّنہ کا حصہ بن سکتے ہیں تاہم ان کے کرنے کا اہم ترین کام حکومتی معاملات کی نگرانی ہے اور جہاں قانون

سازی یا کسی اور معاملے میں افراط وتفریط کا معاملہ سامنے آئے اُسے اعلیٰ عدلیہ کے ذریعے ثابت کر کے اس کی اصلاح ہے۔

(12) دورحاضر میں عورتوں کا کردار بھی بہت اہم ہے اُن کے لئے تعلیم کے دروازے کھلے رکھنے چاہئیں اور بعض اُمور میں جیسے بچیوں کی تعلیم وتربیت، ہسپتالوں میں عورتوں رہچوں کے وارڈز میں نرسنگ وغیرہ کے اُمور کی تعلیم وتربیت اور ایسے اداروں میں ملازمت کے مواقع سے فائدہ اُٹھانا بھی شامل ہے۔ نیز صحت مند قوم کے لئے عورتوں کی صحت، جسمانی ورزشوں اور کھیلوں کے لئے ضروری اور نگہداشت کا شعبہ مکمل طور پر عورتوں ہی کے ذمہ ہونا لازمی ہے۔ 8-10 سال کے بچوں بچیوں کی ابتدائی مشترکہ کلاسز کی صورت میں کلاس چہارم یا کلاس پنجم تک کی کل تعلیم بھی خواتین اساتذہ ہی کے سپرد کی جاسکتی ہے اس کے بعد مردوں عورتوں کے تعلیمی ادارے علیحدہ ہونا ضروری ہے۔

دورحاضر کی اسلامی ریاست

دورِحاضر کی اصطلاح میں گزشتہ ایک صدی کے حالات ہیں جس میں صنعتی اور فنی ترقی کے ساتھ سائنسی ایجادات واختراعات کا ایک سیلاب آ گیا ہے اور اس کے نتیجے میں علم تک رسائی، اطلاعات کی بہم رسائی، سفر، گفتگو، عالمی حالات سے واقفیت، اب مہینوں، ہفتوں دنوں کے بجائے منٹوں اور سیکنڈوں کی بات رہ گئی ہے دنیا ایک عالمی گاؤں (GLOBAL VILLAGE) بن چکی ہے جہاں ملکی معاملات اب راز نہیں رہے سیٹلائٹ کے ذریعے کسی جگہ کی معلومات فوراً حاصل کی جاسکتی ہیں۔ گوگل ارتھ ٹیکنالوجی (GOOGLE EARTH TECHNOLOGY) کے ذریعے دنیا کے کسی حصے کے بارے میں جغرافیائی اور موسمی معلومات، نقشے، انسانی نقل وحرکت نہ صرف دیکھی جاسکتی ہے بلکہ اور اس کی فوٹوگرافی کر کے محفوظ بھی کی جاسکتی ہے۔

اس صورت حال نے ریاستی معاملات میں بھی ہل چل پیدا کر دی ہے۔ قیام پاکستان کے وقت مغربی نظریات کے زیر اثر دنیا بھر میں ایک طرف قومی ریاستوں کا تصور تھا اور عروج پر تھا اور دوسری طرح جمہوریت کا چرچا تھا۔ آج بھی دنیا انہیں پیمانوں سے حالات کو دیکھتی ہے۔

بنیادی انسانی حقوق اور بالخصوص اقلیتوں کے حقوق کی نگہداشت آج مسئلہ ہے، UNO کا ادارہ جو مغربی طاقتوں کی لونڈی ہے اور صہیونی عزائم کے لئے آلۂ کار۔ تاہم اس کے اثرات سے یکسر آزاد بھی رہنا ممکن نہیں۔

لہٰذا.....آج کے دور کی اسلامی ریاست میں اسلامی تصورات کے اندر رہتے ہوئے ریاستی اُمور کو عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے آگے بڑھانا ہی اصل امتحان ہے۔

قیام پاکستان.....نظریاتی فلاحی مملکت کے 65 قمری سال

(14 اگست 1947ء بمطابق 27 رمضان المبارک 1366ھ)

الحمدللہ کہ قیام پاکستان کے ساتھ ہی پاکستان کے حصے میں آنے والے آل انڈیا مرکزی حکومت کے ممبران ہی پاکستان کی دستور ساز اسمبلی قرار پائی، قائداعظم محمد علی جناح نے خود اس کی رہنمائی فرمائی اور ممبران اسمبلی میں بھی اسلامی جذبہ عروج پر تھا جبکہ عوام میں قیام پاکستان کا جوش وخروش اور اسلامی ریاست کے قیام کی اُمنگ جوبن پر تھی۔ ان حالات میں مارچ 49ء میں دستور ساز اسمبلی نے یہ کارنامہ سرانجام دیا کہ آئین سازی کے ضمن میں اُصولی رہنمائی کے لئے قرارداد مقاصد منظور کر لی جو بعد کی آئینی پیش رفت کا زینہ بن گئی۔ تاہم.....بیسویں صدی تک مسلمان زعماء، دانشور، اہل علم وفن اور علماء اسلامی ریاست کے بنیادی تقاضوں پر سیر حاصل بنیادی تحقیقی کام اور ممبران اسمبلی کی تربیت کا کام نہیں کر پائے تھے جس کی وجہ سے پاکستان میں دستور سازی کے عمل میں پہاڑوں جیسی رکاوٹیں آ گئیں۔ ثانیاً دشمنوں کی ریشہ دوانیاں، عالمی طاقتوں کی ناراضگی اور صہیونی منصوبوں میں اسلامی ریاست کے قیام سے رخنہ اندازی کا خوف ایسے عوامل تھے جو پاکستان میں دستور سازی کے عمل کو صحیح سمت میں آگے بڑھانے سے روکے رہے۔ تا آنکہ مارچ 56ء میں اسلامی دستور منظور ہو گیا اور نفاذ بھی عمل آ گیا۔

1958ء میں ملک میں فوج نے اقتدار سنبھال کر جنرل ایوب خان نے مارشل لاء نافذ کر دیا اور 69ء تک خود حکومت کی 56ء کا آئین منسوخ کر کے نیا آئین (1960ء) بنا دیا۔ 69ء میں ہنگامے ہوئے تو اقتدار جنرل یحییٰ خان کو دے کر خود ہی اپنے آئین کی خلاف ورزی کر دی۔ مشرقی پاکستان میں حالات خراب ہوئے تو بھارت سے جنگ چھڑ گئی۔ سیاسی اقدامات کی بجائے

فوجی اقدامات نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور دشمنوں کی سازشوں سے مشرقی پاکستان علیحدہ ہو کر دسمبر 71ء میں بنگلہ دیش بن گیا۔

موجودہ پاکستان میں سیاسی حکومت ذوالفقار علی بھٹو صاحب کو ملی اُنہوں نے 1973ء کا متفقہ آئین منظور کرایا جو بہرحال اسلام کی تعلیمات کا آئینہ دار تھا۔ 1974ء میں قادیانیوں کو اسمبلی سے غیر مسلم قرار دے کر آئینی ضرورت پوری کر دی کہ اسلامی ریاست کا اصل شہری صرف مسلمان ہی ہوسکتا ہے جو حضرت محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا آخری پیغمبر (جیسا کہ وہ ہیں) تسلیم کرے۔ پھر حالات خراب ہوئے تو جولائی 77ء میں بھٹو صاحب کی حکومت برطرف کر کے جنرل ضیاء الحق نے دوسری بار مارشل لا لگا دیا اور گیارہ سال حکومت کی انہوں نے آئینی سطح چند اصلاحات کیں، بمشکل آئین بحال ہوا۔ جنرل ضیاء الحق کی اگست 88ء میں حادثاتی موت کے بعد ملک میں دوبارہ جمہوری عمل شروع ہوا تو حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہیں۔ عالمی طاقتیں دوستی کی آڑ میں ہمارے معاملات کو ہمیشہ سبوتاژ کرتی رہیں تا کہ آنکہ اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے مئی 98ء میں پاکستان نے ایٹمی قوت حاصل کر لی۔ اب تو گویا دشمن قوتوں کی نیندیں حرام ہو گئیں ایسے حالات پیدا کر دیے کہ اکتوبر 99ء میں جنرل مشرف صاحب نے پھر مارشل لاء لگا کر حکومت سنبھال لی۔

اب اللہ اللہ کر کے دو سال سے جمہوری حکومت بحال ہوئی ہے مگر عالمی طاقتیں آئین اور آئینی عملداری کے ذریعے پاکستان کے حالات کو سدھرنے نہیں دیتیں اور خواہی نہ خواہی اس میں مداخلت اپنا فرض منصبی سمجھتی ہیں۔ اب اگرچہ آئین بحال ہے مگر 1973ء۔2010ء، 37 سالوں میں 18 ترامیم ہو چکی ہیں اور 19 ویں ترمیم کا عندیہ ظاہر کر دیا گیا ہے جس سے اس آئین کا اسلامی تشخص گہنا گیا ہے۔

اسلامی نظریاتی ریاست میں اس آئین سازی کی تاریخ میں آج تک صرف یہ حاصل ہوا ہے کہ دور حاضر میں تجربات کے بعد ریاست کا بنیادی ڈھانچہ یعنی آئین (CONSTITUTION)..... مقنّنہ (LEGISLATIVE) انتظامیہ (EXECUTIVE) اور عدلیہ (JUDICIARY) وجود میں آ گئے ہیں اور اب ماشاء اللہ جوان میں ہیں اپنے پاؤں پر کھڑے ہیں بیدار ہیں کہ ایک دوسرے کو اپنے معاملات میں مداخلت کے

بارے میں بڑے حساس(SENSITIVE) ہیں۔الحمدللہ

نظریاتی اسلامی ریاست کے ستون

عصر حاضر میں ریاست کے اُمور کے ماہرین اور آئینی ماہرین کے نزدیک ایک کامیاب ریاست کے لئے آئین کے علاوہ تین چیزیں ازحد بنیادی ہیں۔اس وقت دنیا میں 200 کے قریب خودمختار ممالک یعنی ریاستیں ہیں اور علمی دنیا میں موبائل فون، SMS، E-mail اورانٹرنیٹ کے ذریعے ہر وقت اہل علم آپس میں رابطہ رکھے ہوئے ہیں۔ان حالات میں کسی ریاست کے ریاستی اداروں کے بارے میں معلومات اب ہر شخص کی دسترس میں ہیں اس میں انسانی ضرورتوں کے مطابق بہتری کی کوششیں بھی جاری رہتی ہیں۔امریکہ،فرانس، اور برطانیہ جیسی قدیم جمہوری ریاستیں بھی تجربات کے ذریعے آئینی اصلاحات کا اہتمام کرتی رہتی ہیں۔لہٰذاان تجربات اورعمرانی ارتقائی کوششوں کے نتیجہ میں اب ریاست چلانے کا کام ایک 'فن' اور شعبۂ علم بن گیا ہے اور ریاستی معاملات کے بارے بحث وتمحیص اور بہتری کے طریقے سوچنااب STATE-CRAFT یعنی 'تعمیر ریاست' یا 'ریاست سازی' کا شعبہ علم کہلاتا ہے۔ اس کے مطابق عام طور پر مغربی مفکرین کے نزدیک ریاست کے چند شعبے بہت اہم ہیں اور جیسے کسی عمارت کو سہارا دینے کے لئے ستونوں کی ضرورت ہوتی ہے بعینہٖ اسی طرح ریاست کو سنبھالنے اور سہارا دینے والے یہ اُمور ریاستی ستون (PILLARS OF THE STATE) کہلاتے ہیں

(i) مقنّنہ (ii) انتظامیہ (iii) عدلیہ

دورحاضر میں ایک ریاست آئین کی رو سے چلائی جاتی ہے آئین ہی میں حاکمیت اعلیٰ (SOVEREIGNITY) طے کردی جاتی ہے۔عوامی رائے سے مقنّنہ وجود میں آتی ہے مقنّنہ ریاست کا اعلیٰ ترین ادارہ ہوتی ہے یہ اکثر ایوان بالا اور ایوان زیریں یا سینٹ اور کانگریس یا سینٹ اورقومی اسمبلی کہلاتی ہے ایوان میں اکثریت کی بنیاد پر وزیراعظم بنتا ہے جو اپنی کابینہ بنا کر ملک کے انتظام چلانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ پارلیمنٹ (ایوان بالا+ ایوان زیریں+ صوبائی

اسمبلیاں) ملک کے صدر کا انتخاب کرتی ہیں جو ریاست کا محافظ اور آئین کے مطابق ریاستی امور کے چلائے جانے کی نگرانی کرتا ہے۔ یہ پارلیمانی نظام ہے۔ یہ نظام صدارتی بھی ہوسکتا ہے۔

آئین

انتظامیہ　　مقنّنہ　　عدلیہ

ریاست کے ان تین ستونوں کے علاوہ بھی کئی شعبے ہیں جو ستون ہی طرح کی اہمیت رکھتے ہیں اور دنیا میں تسلیم کیے جاتے ہیں۔

چوتھا ستون.....فوج

کسی ملک/ریاست کی حفاظت کے لیے امن کی حالت میں مقنّنہ، انتظامیہ اور عدلیہ ہی نگرانی کا فریضہ سرانجام دیتی ہیں۔فوج بیرونی حملہ کی صورت میں ملک کی حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہے اسی لئے ہر متمدن اور پُرامن ملک میں دور حاضر میں بھی باقاعدہ مسلح افواج (STANDING ARMIES) ہیں۔ بری فوج، فضائیہ اور بحری فوج مل کر ہی کسی ریاست کی حفاظت کے قابل ہوسکتی ہیں۔آج کے دور میں بھی اکثر ملکوں کے بجٹ کا بہت بڑا حصہ ملکی افواج پر ہی خرچ ہوتا ہے۔امن ہو یا جنگ یہ افواج اپنے فرائض منصبی میں مگن رہتی ہیں۔

پانچواں ستون.....صحافت/میڈیا

ریاست کے تحفظ اور صحیح سمت میں سفر میں ایک اور شعبہ جو دن بدن پہلے سے زیادہ ضروری ہوتا جارہا ہے وہ صحافت کا شعبہ ہے اور صحافی حضرات ہیں۔آج کل صحافت کا دائرہ کار زیادہ وسیع ہوگیا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے اب میڈیا (MEDIA) کی اصطلاح زیادہ استعمال ہوتی ہے۔

میڈیا

الیکٹرانک میڈیا　　پرنٹ میڈیا

دور حاضر میں اس میڈیا کے دو بڑے حصے بن گئے ہیں ایک حصہ ٹی وی چینلز، ریڈیو، ٹی وی مباحثے، مذاکرے، خبریں وغیرہ ہیں دوسرے حصے میں اخبارات رسائل کتابیں وغیرہ آتی

ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا کی اہمیت اخبارات سے بھی بڑھتی جارہی ہے کہ اس میں بہت سارے پروگرام، مباحثے، گفتگو، بیانات فوری اور LIVE دکھا دیے جاتے ہیں جس سے انسان فوری تاثر لے لیتا ہے اور سامعین وقارئین کو رائے بنانے اور فیصلہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

آج کے جمہوری دور میں چونکہ عوامی رائے کی بڑی اہمیت ہے اور یہ میڈیا اور میڈیا پر نمودار ہونے والے کردار، اپنے طرز عمل، طرز گفتگو اور ترجیحات سے رائے عامہ کو کم سے کم وقت میں بدلنے کی طاقت اور وسائل رکھتے ہیں۔ لہٰذا ــــــــــــ عوام اور حکومت (انتظامیہ) دونوں ان کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ مثلاً خبروں میں کس خبر کو زیادہ اہمیت دینی ہے اور فوری کاسٹ کرنی ہے یا اس کو موخر کر دینا ہے کس خبر کو فوری اہمیت کی خبر (BREAKING NEWS) بنانا ہے اور کس کو نہیں۔ یہ میڈیا کے کارپردازوں کا فیصلہ ہے یا اخبارات کے صحافیوں کا اور کالم نگاروں کا۔ لہٰذا یہ شعبہ بھی آج کی ریاست کے امور میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل بن گیا ہے اور حکومتیں اپنی غلطیوں کو چھپانے، گھپلوں کو عوام کی نگاہوں سے اوجھل رکھنے اور حکومتی غلط فیصلوں کو عام ہونے سے بچانے کے لئے میڈیا پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ میڈیا پر جائز/ناجائز دباؤ بھی پڑتا ہے ایک طرف مراعات اور سرکاری اشتہار بھی ملتے ہیں جس سے اخبارات اور میڈیا کو بے پناہ آمدنی ہوتی ہے۔ یہی سرکاری اشتہارات کبھی میڈیا کو 'دبانے' اور سبق سکھانے کے لئے بطور لیور (LEVER) روک بھی لیے جاتے ہیں جس سے اس 'حق کی آواز' کو دبانا مقصود ہوتا ہے۔ اس لئے حکومت پر تنقید، غلطیوں کی نشاندہی، غلط فیصلوں پر بروقت انتباہ، حکومتی شاہ خرچیوں کی تفاصیل سے عوام کو صحیح وقت پر آگاہی ہو جاتی ہے جبکہ اسی شعبے میں پھر کالی بھیڑیں بھی ہوتی ہیں جو حکومتی مراعات کے نتیجے میں سچی خبریں عوام تک نہیں پہنچنے دیتیں۔ ایسے چینلز اور اخبارات غلط تبصرے، غلط موضوعات پر مذاکرات، بے موقع کے پروگراموں سے عوام کو گمراہ کرتے رہتے ہیں اور رائے عامہ کو راہ راست سے ہٹانے (DE-RAIL کرنے) کا سبب بنتے ہیں۔ غیر ملکی ایجنسیاں اور ملکی وغیر ملکی مافیا بھی اس صورت سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔

عوامی بیداری اور رائے عامہ کے بنانے/بگاڑنے میں آج میڈیا کا کردار بنیادی ہے اور ریاستی امور میں اکھاڑ پچھاڑ کا ذریعہ ہے لہٰذا ــــــــــــ یہ بھی ریاست کا اہم ستون کہلاتا

ہے۔اس ستون کی حفاظت اور صحیح سمت میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ریاست کے مفاد میں ہے۔

ریاست اور نظام تعلیم

دور حاضر میں ایک اہم شعبہ ــــــــــــ کسی ملک یا ریاست کا نظام تعلیم ہے۔ اس نظام تعلیم سے گزر کر اور تربیت پا کر ہی ریاست کو وہ کارکنان اور اہل کار (WORKING HANDS) میسر آتے ہیں جو مستقبل میں ریاست کو چلانے کے ذمہ دار بنتے ہیں اور جن کے کاندھوں پر ریاست کی ذمہ داریوں کا بوجھ آتا ہے۔

دو قسم کی ریاستیں ــــــ دو قسم کے نظام تعلیم

آج یہ بات زیادہ وضاحت کی محتاج نہیں ہے اور اہل علم خوب جانتے ہیں کہ ریاستوں کے مزاج میں ایک واضح فرق ہے اور دور حاضر کی ریاستوں کو دو خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

جدید ریاست

نظریاتی ریاست　　غیر نظریاتی ریاست

اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں دنیا میں موجود 200 کے قریب ملکوں میں سے اکثریت علانیہ طور پر غیر نظریاتی ریاستیں ہیں جبکہ دو ریاستیں اسرائیل اور پاکستان نظریاتی ریاستیں کہلاتی ہیں۔

نظریاتی ریاست

ایک ایسی ریاست جو اپنے وجود کے لئے بطور جواز ــــــــــــ ایک نظریہ کی محتاج ہے وہ نظریاتی ریاست (IDEAOLOGICAL STATE) کہلاتی ہے اور یہ نظریہ چونکہ اس کی وجہ جواز اور وجود کے لیے لازمہ (PREREQUISITE) کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا ایک نظریاتی ریاست اس بات کا اہتمام کرتی ہے کہ اس ریاست کا ہر شعبہ اور ہر کام اور ہر فیصلہ اس نظریہ کی بنیاد پر ہی ہو۔ ریاست کی حفاظت اپنی جگہ اہم ہے۔ نظریاتی ریاست کے لئے اپنے نظریہ کی حفاظت مقدم نہیں تو ریاست کے برابر کی اہمیت کی حامل ضرور ہوتی ہے۔ ریاست کی حفاظت زمینی، فضائی یا بحری حملوں سے بچاؤ کی تدابیر سے بھی کی جاتی ہے اور فوج اس کی ذمہ دار

ہے جبکہ ــــــــــــ نظریہ کی حفاظت علمی اور نظریاتی حملوں سے بچاؤ کی صورت میں ہوسکتی ہے۔نظریاتی جنگ کی کوئی حدود اور سرحدیں نہیں رہتی۔ریاست کی حفاظت ایک جغرافیائی جنگ ہے جبکہ نظریہ کی حفاظت دنیا میں اٹھنے والی ہر مؤثر و مدلل آواز کے خلاف بھی ضروری ہے جو اس ریاست کے نظریہ کو للکار رہی ہو یا چیلنج کر رہی ہو۔لہٰذا نظریہ کی حفاظت اپنی اہمیت اور ریاستی وجود کے جواز کے لیے سرحدوں کی حفاظت سے کہیں زیادہ اہم اور کہیں زیادہ ناگزیر بن جاتی ہے۔

غیر نظریاتی ریاست

ایسی ریاستیں جو غیر نظریاتی ریاستیں کہلاتی ہیں ان کی بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے۔ نظریاتی ریاستیں اپنے ایک واضح موقف، نقطہ نظر اور فکر (THOUGHT) پر ڈٹ جاتی ہیں اور اسی میں ان کی بقا مضمر ہے اسی سے نظریاتی ریاستیں باقی رہتی ہیں۔جبکہ غیر نظریاتی ریاستیں بھی اپنی اصل کے اعتبار سے نظریاتی ریاستیں ہی ہوتی ہیں اس لیے کہ غیر نظریاتی ہونا بھی ایک نظریہ ہے۔ غیر نظریاتی ریاستیں آج کل سیکولر کہلاتی ہیں اور عملاً (FOR ALL PRACTICAL PURPOSES) وہ نظریاتی ہی سمجھی جاتی (TREAT) ہیں۔

آج سے پچاس سال پہلے دنیا میں دو سپر پاورز تھیں USSR اور USA اور بالعموم باقی تمام ممالک ان دو سپر پاورز کے ساتھ منسلک تھے اور اسی نظام کے مؤید اور مداح تھے۔اس وقت بھی بعض ممالک (ریاستیں) مل کر ایک 'غیر جانبدار تحریک' بنانے میں کامیاب ہوگئیں جو NON-ALLIGNED MOVEMENT-NAM کہلاتی تھیں۔گویا کسی نظریاتی جنگوں کے ماحول میں 'غیر جانبدار' یا 'غیر نظریاتی' رہنا بھی ایک نظریہ ہی شمار کیا جانا چاہیے اور جیسے اوپر عرض کیا گیا ہے ــــــــــــ غیر نظریاتی ریاستیں بھی تمام معاملات میں عملاً نظریاتی ریاستوں کی طرح ہی اپنے معاملات کو چلاتی ہیں۔

غیر نظریاتی یا سیکولر ریاستیں

غیر نظریاتی یا سیکولر ریاستوں کو بھی اپنے آئین میں اپنے لئے ایک راستہ طے کر لینے کے بعد عملاً ریاست کے ہر شعبے میں ایک نظریاتی ریاست کی طرح اجتماعی بیداری اور شعور کا ایک

خاص لیول (LEVEL) پر برقرار رکھنا پڑتا ہے جس سے ریاست کے مختلف شعبوں میں یگانگت (HOMOGENITY) اور ہم آہنگی (CO-OPERATION) کی فضا قائم بھی ہو اور اُسے برقرار بھی رکھا جا سکے۔ تاہم سیکولر ریاستیں عموماً رواج اور عالمی سطح کی علمی، معاشی، تکنیکی اور نظریاتی فضا کے تحت عوامی رائے کی تبدیلی کے مطابق چلنے کی پابند ہوتی ہیں لہٰذا ایسی ریاستیں غیر محسوس طریقے پر خارجی دباؤ اور آج کے ماحول میں میڈیا کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ ایسی ریاستوں کے ادارے بھی عالمی علمی بحثوں اور دوسری ریاستوں کی کامیابیوں سے استفادہ حاصل کرنے کے نام پر ریاستی آئین سے انحراف کے امکانات کے بہت قریب ہوتے ہیں۔ ایسی ریاستیں اگر کسی وقتی غلط فیصلے یا خارجی دباؤ میں کوئی ایسا راستہ اختیار کر لیتی ہیں جو ان کے مزعومہ سیکولر نظریات کے خلاف ہے تو بھی چند سال بعد جب احساس ہو اُسے واپس اُسی ڈگر پر لے آتی ہیں اور ان کا زیادہ نقصان یعنی ملکی سطح پر کوئی بڑا SETBACK نہیں پہنچتا۔

نظریاتی ریاستیں (IDEALOGICAL STATES)

نظریاتی ریاست میں نظریہ کی حفاظت ایک اہم اور بنیادی کام ہے جو ریاست کو اجتماعی طور پر بھی کرنا پڑتا ہے اور اس کے ہر ادارے کو بھی باریک بینی سے اس کی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔ اس کی مقنّنہ، انتظامیہ اور عدلیہ میں براجمان افراد اس فرض کی ادائیگی میں معمولی کوتاہی کریں گے تو اس کا کئی گنا زیادہ اثر ان کے فیصلوں اور اندرون ملک و بیرون ملک پالیسوں پر پڑے گا۔ نتیجے کے طور پر عوامی سطح پر اس کے اثرات بہت زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آجائیں گے اس میں پانچ دس سال کا عرصہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ مگر ایسی کوتاہیوں کے نتائج معاشرے میں ظاہر ہو کر رہتے ہیں اور ایسی کوتاہیاں ریاست کی نظریاتی بنیادوں کو کمزور کرنے کا باعث بنتی ہیں چنانچہ ریاست کی ذمہ داریوں میں نظریہ کی حفاظت بہت ہی ضروری کام ہے جس کو حاضر دماغی، بیدار مغزی اور انتھک محنت سے مسلسل سرانجام دینا بہت ضروری ہے۔

حصہ پنجم

اہل علم کے افکار

☆ قائداعظم کا تصور پاکستان — ڈاکٹر اسرار احمد

☆ ریاست مدینہ، پاکستان اور دو قومی نظریہ — میاں صدیق صادق

☆ انقلاب بذریعہ تعلیم! کونسا انقلاب؟ کیسی تعلیم؟ — عبدالرشید ارشد

☆ نظریاتی تعلیم — ڈاکٹر محمد رفیع الدین

قائداعظم کا تصورِ پاکستان

ڈاکٹر اسرار احمد

1937ء سے 1947ء تک قائداعظم نے اسلام کا جو راگ الاپا ہے اس پر ان کے ایک سو اقتباسات (QUOTATIONS) موجود ہیں۔ ان دس سالوں کے دوران اُنہوں نے اپنی تقاریر میں برملا کہا ہے کہ ہمارا قانون، ہمارا نظام، بلکہ ہماری ہر شے اسلام کے مطابق ہوگی۔ ان کے علاوہ ان کی تقاریر کے چالیس اقتباسات اور بھی ہیں جو ان کی پاکستان بننے کے بعد کی تقاریر سے ماخوذ ہیں جن میں اُنہوں نے اسلام ہی کی بات کی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کا سیکولر حلقہ ان کی صرف ایک تقریر کے چند الفاظ کو ان کے باقی تقریباً ڈیڑھ سو خطابات پر حاوی قرار دے کر اسے دستورِ پاکستان کا حصہ بنانا چاہتا ہے۔ میں یہاں پر قائداعظم محمد علی جناح کی تقاریر کے صرف دو حوالے دوں گا، جس سے اندازہ کیجئے کہ یہ مسٹر محمد علی جناح بول رہے ہیں یا مولانا محمد علی جناح خطاب فرما رہے ہیں! 11 جنوری 1938ء کو گیا ریلوے اسٹیشن (بہار) پر ایک بہت بڑے مجمع عام سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے مسلم لیگ کا جھنڈا لہرا کر فرمایا:

"TODAY IN THIS HUGE GATHERING YOU HAVE HONOURED ME BY ENTRUSTING THE DUTY TO UNFURL THE FLAG OF THE MUSLIM LEAGUE, THE FLAG OF ISLAM, FOR YOU CAN NOT SEPARATE THE MUSLIM LEAGUE FROM ISLAM. MANY PEOPLE MISUNDERSTAND US WHEN WE TALK OF ISLAM PARTICULARLY OUR HINDU FRIENDS. WHEN WE SAY "THIS FLAG IS THE FLAG OF ISLAM" THEY THINK WE ARE INTRODUCING RELIGION INTO POLITICS-

A FACT OF WHICH WE ARE PROUD. ISLAM GIVES US A COMPLETE CODE. IT IS NOT ONLY RELIGION BUT IT CONTAINS LAWS, PHILOSOPHY AND POLITICS. IN FACT, IN CONTAINS EVERYTHING THAT MATTERS TO A MAN FROM MORNING TO NIGHT. WHEN WE TALK OF ISLAM WE TAKE IT AS AN ALL-EMBRACING WORD. WE DO NOT MEAN ANY ILL WILL. THE FOUNDATION OF OUR ISLLAMIC CODE IS THAT WE STAND FOR LIBERTY; EQUALITY AND FRATERNITY."

''آج اس عظیم الشان اجتماع میں آپ نے مجھے مسلم لیگ کا جھنڈا لہرانے کا اعزاز بخشا ہے۔ یہ جھنڈا درحقیقت اسلام کا جھنڈا ہے، کیونکہ آپ مسلم لیگ کو اسلام سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ بہت سے لوگ بالخصوص ہمارے ہندو دوست ہمیں غلط سمجھتے ہیں۔ جب ہم اسلام کی بات کرتے ہیں یا جب ہم کہتے ہیں کہ یہ جھنڈا اسلام کا جھنڈا ہے تو وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم مذہب کو سیاست میں گھسیٹ رہے ہیں، حالانکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر ہم فخر کرتے ہیں۔ اسلام ہمیں مکمل ضابطہ حیات دیتا ہے۔ یہ نہ صرف ایک مذہب ہے بلکہ اس میں قوانین، فلسفہ اور سیاست سب کچھ ہے۔ درحقیقت اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی ایک آدمی کو صبح سے رات تک ضرورت ہوتی ہے۔ جب ہم اسلام کا نام لیتے ہیں تو ہم اسے ایک کامل لفظ کی حیثیت سے لیتے ہیں۔ ہمارا کوئی غلط مقصد نہیں، بلکہ ہمارے اسلامی ضابطہ کی بنیاد آزادی، عدل و مساوات اور اُخوت ہے۔''

"LET US GO BACK TO OUR HOLY BOOK THE QURAN; LET US REVERT TO THE HADITH AND THE GREAT TRADITIONS OF ISLAM, WHICH HAVE EVERY THING IN THEM FOR OUR

GUAIDANCE IF WE CORRECT INTERPRET THEM AND FOLLOW OUR GREAT HOLY BOOK THE QURAN."

''ہمیں قرآن پاک، حدیث شریف اور اسلامی روایات کی طرف رجوع کرنا ہوگا جن میں ہمارے لئے مکمل رہنمائی ہے، اگر ہم ان کی صحیح ترجمانی کریں اور قرآن پاک پر عمل پیرا ہوں۔''

یہاں پر قائداعظم محمد علی جناح کی تقاریر کی چند شہ سرخیاں پیش خدمت ہیں:

☆ 6 جون 1938ء: ''مسلم لیگ کا جھنڈا نبی اکرم ﷺ کا جھنڈا ہے۔''

☆ 22 نومبر 1938ء: ''اسلام کا قانون دنیا کا بہترین قانون ہے۔''

☆ 8 اپریل 1938ء: اسٹار آف انڈیا: ''ملت اسلامیہ عالمی ہے۔''

☆ 7 اگست 1938ء: ''میں اوّل و آخر مسلمان ہوں۔''

☆ 9 نومبر 1939ء: ''مغربی جمہوریت کے نقائص۔''

☆ 14 نومبر 1939ء: ''انسان خلیفۃ اللہ ہے۔''

☆ ٹائمز آف لندن 9 مارچ 1940ء: ''ہندو اور مسلمان دو جداگانہ قومیں ہیں۔''

☆ 26 مارچ 1940ء: ''میرا پیغام قرآن ہے۔''

قائداعظم نے اقلیتوں کو بھی کچھ یقین دہانیاں کرائیں کہ ان کو خوف نہیں ہونا چاہیے ان کے ساتھ پاکستان میں فراخ دلانہ سلوک کیا جائے گا۔ اس ضمن میں ان کی 29 مارچ 1944ء کی تقریر سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور میں شائع ہوئی، جس کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

Mr.JINNAH ASSURED THE NON-MUSLIM MINORITIES THAT IF PAKISTAN WAS ESTABLISHED, THEY WOULD BE TREATED WITHFAIRNESS, JUSTICE AND EVEN GENEROSITY. THIS WAS ENJOINED UPON THEM BY THE QURAN AND THIS WAS THE LESSON OF THEIR HISTORY HAD TAUGHT

THEM WITH A FEW EXCEPTIONS IN WHICH SOME INDIVIDUALS MAY HAVE MISBEHAVED. "

''مسٹر جناح نے غیر مسلم اقلیتوں کو یقین دلایا کہ اگر پاکستان قائم ہو گیا تو اُن کے ساتھ رواداری، انصاف اور فیاضی کا سلوک کیا جائے گا۔ اقلیتوں کو یہ حقوق قرآن نے دیے ہیں اور مسلمانوں کی تاریخ ان کو یہی سبق سکھاتی ہے، البتہ چند استثنائی صورتوں میں ممکن ہے کہ بعض افراد نے بدسلوکی کی ہو۔''

اب اسی کے حوالے سے قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کا صرف ایک جملہ ایسا ہے کہ جسے سیکولر ذہن رکھنے والے دانشوروں نے سیکولرزم کی بنیاد قرار دے دیا ہے اور جسٹس منیر نے تو اس ایک جملے پر پوری کتاب لکھ دی ہے۔ حالانکہ اس جملے کا بھی 95% حصہ اسلامی ہے، صرف 5% حصہ ایسا ہے جس کی مختلف تعبیرات کی گئی ہیں اور اس سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قائداعظم پاکستان کو ایک سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔ اس خطاب میں اُنہوں نے کہا تھا:

"YOU ARE FREE; YOU ARE FREE TO GO TO YOUR TEMPLES, YOY ARE FREE TO GO TO YOUR MOSQUES OR TO ANY OTHER PLACES OF WORSHIP IN THIS STATE OF PAKISTAN."

''آپ آزاد ہیں، آپ کو اپنے معبدوں میں جانے کی اجازت ہے، پاکستان کی اس ریاست میں آپ کو اپنی مساجد یا کوئی بھی دوسری عبادت گاہوں میں جانے کی آزادی ہے۔''

اور یہ بالکل صحیح ہے کہ اسلامی ریاست میں بھی مذہبی آزادی سب کو ملتی ہے۔ صرف قریش کا معاملہ خصوصی تھا اور ان کے لئے یہ حکم تھا جو سورۃ التوبہ کی ابتدائی چھ آیات میں وارد ہوا کہ اگر ایمان نہیں لاؤ گے تو قتل کر دیئے جاؤ گے۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ خود قریشی تھے اور آپ ﷺ کی قریش کی طرف خصوصی بعثت تھی۔ بعد میں سب کے لئے یہی اُصول تھا کہ اسلام لے آؤ تو ہمارے برابر کے ساتھی ہو گے۔ ہم یہ بھی دعویٰ نہیں کریں گے کہ ہم سینئر مسلمان ہیں اور تم جونیئر مسلمان ہو،

ہمارے حقوق زیادہ ہیں اور تمہارے کم۔ البتہ اگر اسلام نہیں لاتے تو جزیہ دو اور چھوٹے بن کر رہو، لیکن تمہیں مکمل مذہبی آزادی حاصل رہے گی اور پوری تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ کہیں پر بھی اور کسی ایک شخص کو بھی بالجبر مسلمان نہیں بنایا گیا۔ ہاں اگر طاقت ہے تو نظام صرف اللہ کا ہوگا، دین صرف اللہ کا قائم کیا جائے گا، اس لئے کہ انسانوں کے لئے اسی نظام میں رحمت ہے، سوشل جسٹس ہے، جو اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے ذریعے نوع انسانی کو عطا کیا ہے۔ باقی یہ کہ مذہبی آزادی سب کو حاصل ہے۔ اسی خطاب میں قائداعظم نے فرمایا:

"YOU WILL FIND THAT IN COURSE OF TIME HINDUS WOULD CEASE TO BE HINDUS AND MUSLIMS WOULD CEASE TO BE MUSLIMS, NOT IN THE RELIGIOUS SENSE, BECAUSE THAT IS THE PERSONAL FAITH OF EACH INDIVIDUAL, BUT IN THE POLITICAL SENSE AS CITIZENS OF THE STATE."

اس میں قائداعظم نے یہ جو فرمایا ہے کہ ''مذہب ہر شخص کا انفرادی معاملہ ہے'' اس وقت پوری دنیا کا اُصول یہی ہے۔ البتہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ مذہب نہیں ہے، بلکہ دین ہے اور پوری زندگی کا نظام دیتا ہے، اور یہ بات قائداعظم بھی اپنی تقاریر میں کہہ چکے ہیں۔ اگر قائد کے اس جملے کو ان کی بقیہ تقاریر کی روشنی میں سمجھا جاتا تو غلط فہمی کا امکان پیدا نہ ہوتا۔ لیکن غلط فہمی بہرحال پیدا ہوئی ہے۔ یہ کس وجہ سے ہوئی، یہ ایک علیحدہ بحث ہے، جس میں اس وقت نہیں جانا چاہتا۔ لیکن سیکولر حلقے اس کی جو تعبیر کر رہے تھے قائداعظم نے خود اس کی نفی کر دی تھی۔ چنانچہ 25 جنوری 1948ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے دوٹوک انداز میں فرمایا تھا:

"ISLAMIC PRINCIPLES TODAY ARE AS APPLICABLE TO LIFE AS THEY WERE THIRTEEN HUNDRED YEARS AGO. HE COULD NOT UNDERSTAND A SECTION OF THE

PEOPLE WHO DELIBERATELY WANTED TO CREATE MISCHIEF AND PROPAGANDA THAT THE CONSTITUTION OF PAKISTAN WOULD NOT BE MADE ON THE BASIS OF SHARIAT."

''اسلامی اُصول آج بھی ہماری زندگی کے لئے اسی طرح قابل عمل ہیں جس طرح تیرہ سو سال پہلے قابل عمل تھے۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ لوگوں کا ایک گروہ جان بوجھ کر فتنہ اندازی سے یہ بات کیوں پھیلانا چاہتا ہے کہ پاکستان کا آئین شریعت کی بنیاد پر مدوّن نہیں کیا جائے گا۔''

یعنی جو لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کا دستور شریعت کے مطابق نہیں بنے گا وہ فتنہ پرور اور شرارتی ہیں اور غلط پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔

قائداعظم کے حوالے سے مزید جان لیجئے کہ ان کی وفات سے دو تین دن پہلے پروفیسر ڈاکٹر ریاض علی شاہ صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی اور قائداعظم نے ان سے فرمایا:

''تم جانتے ہو کہ جب مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ پاکستان بن چکا ہے، تو میری روح کو کس قدر اطمینان ہوتا ہے! یہ مشکل کام تھا اور میں اکیلا اسے کبھی نہیں کر سکتا تھا، میرا ایمان ہے کہ یہ رسول خداؐ کا روحانی فیض ہے کہ پاکستان وجود میں آیا۔ اب یہ پاکستانیوں کا فرض ہے کہ وہ اسے خلافت راشدہ کا نمونہ بنائیں تاکہ خدا اپنا وعدہ پورا کرے اور مسلمانوں کو زمین کی بادشاہت دے۔''

میں خود یہ کہتا ہوں کہ اس سے پہلے تک میرے دل میں قائداعظم کی عظمت بھی تھی، جذبۂ شکر بھی تھا، لیکن محبت نہیں تھی۔ 11 ستمبر 1988ء کے روزنامہ جنگ میں مذکورہ بالا الفاظ دیکھ کر ان سے محبت بھی پیدا ہوگئی۔ دیکھئے اس شخص کے اندر کس قدر جذبہ تھا! معلوم ہوا کہ قائداعظم کے علم میں وہ احادیث بھی تھیں جن میں یہ پیشین گوئی ہے کہ قیامت سے قبل پوری دنیا میں نظامِ خلافت قائم ہوگا اور اُمت محمد ﷺ کی حکومت قائم ہوگی۔ ابھی تو حالالت خراب سے خراب تر ہوں گے، مزید آزمائشیں آئیں گی۔ ع ''اور کچھ روز فضاؤں سے لہو برسے گا!'' لیکن آخر کار حالات بدلیں گے۔

اس اعتبار سے ایک ذرا دلچسپ اقتباس بھی ملاحظہ فرمالیں۔1946ء میں برطانیہ کی پارلیمنٹ کا ایک دس رکنی وفد ہندوستان آیا تھا، جس کے چیئرمین رابرٹ رچرڈ تھے۔اس وفد کے ایک رکن مسٹر سورن سن (SORENSON) نے واپس جا کر "MY IMPRESSION OF INDIA" کے نام سے کتاب لکھی جس میں وہ قائداعظم کے بارے میں لکھتا ہے:

"Mr.JINNAH IS THE SWORD OF ISLAM RESTING IN A SECULAR SCABBARD."

یعنی مسٹر جناح اسلام کی تلوار ہیں، البتہ جس نیام میں وہ تلوار ہے اس میں سیکولر رنگ موجود ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ وضع قطع میں مولوی نہیں تھے اور نہ ہی اُنہوں نے مسلمانوں میں مشہور اور مقبول ہونے کے لئے کوئی مصنوعی لبادہ اُوڑھا۔ یہ ان کی شخصیت کا بہت اہم حصہ ہے۔ وہ اپنی سیرت و کردار کے لحاظ سے بہت مضبوط تھے۔

ریاست مدینہ، پاکستان اور دوقومی نظریہ

میاں صدیق صادق

اللہ قادر مطلق اور حکیم وعلیم وبصیر کا ارشاد پاک ہے:

وَ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ O اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ اِنَّا کُنَّا مُنۡذِرِیۡنَ O فِیۡہَا یُفۡرَقُ کُلُّ اَمۡرٍ حَکِیۡمٍ O اَمۡرًا مِّنۡ عِنۡدِنَا (الدخان۔ 1،5)

''قسم ہے اس وضاحت والی کتاب کی، یقیناً ہم نے اسے بابرکت ومبارک رات (لیلۃ القدر) میں اتارا ہے۔ بے شک ہم ڈرانے والے ہیں۔ اسی رات میں ہر ایک کام کا مضبوط ومستحکم فیصلہ ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے''

اللہ رحمٰن ورحیم اور اکرم الاکرمین کی رحمتوں اور لایزال برکتوں سے مالا مال لیلۃ القدر میں بامر الٰہی پاکستان کی اسلامی ریاست کے قیام کی صورت میں اللہ خالق و مالک کائنات کا یہ حکیمانہ، مضبوط ومستحکم فیصلہ اس سرمدی حقیقت کا غماز ہے کہ پاکستان کی تخلیق، اس کا استحکام، ترقی وخوشحالی، اس کا دفاع، اس کی بقاء وسرفرازی اللہ قادر المقتدر کے کائناتی منصوبہ کا ایک اہم اور مضبوط ومستحکم حصہ اور جزو لاینفک ہے۔ یوں چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں دنیا کی اس سب سے بڑی نظریاتی اسلامی ریاست کا دنیا بھر کی مخالفت کے باوجود دنیا کے نقشے پر ابھرنا اور بڑی شان سے ابھرنا ایک بہت بڑا چیلنج، عظیم کارنامہ اور عظیم ترین معجزہ تھا۔ تاریخ کے گہرے مطالعہ سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ گزشتہ چودہ صدیوں میں کوئی ایسی مسلم ریاست معرض وجود میں نہیں آئی جو قدم بہ قدم اور مرحلہ بہ مرحلہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکامات وہدایات وحی کے تحت اللہ کے حبیب اقدس واکرم ﷺ کی قائم کردہ اسلامی ریاست ـــــ ریاست مدینہ ـــــ سے اس قدر گہری، حیرت انگیز اور گوناگوں مماثلتیں رکھتی ہو جتنی کہ یہ اسلامی ریاست مملکت خداداد پاکستان رکھتی ہے۔ قارئین کی حیرتوں کے لئے ان گہری مماثلتوں کا

مختصر جائزہ پیش خدمت ہے۔

(i) جس طرح ریاست مدینہ کی بنیاد ــــ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ــــ یعنی اس پختہ، اٹل اور سرمدی اُصول پر رکھی گئی تھی کہ اقتدار اعلیٰ صرف اور صرف اس ذات وحدہٗ لاشریک، ذوالجلال والاکرام کا حق ہے جو کائناتوں کا خالق اور جہانوں کا پالن ہار ہے اور جہاں قانون میں عمل میں، سیاسی جدوجہد میں، معاشی کاوش اور زندگی کے دیگر معاملات میں اللہ کے حبیب حضور سرور کائنات ﷺ کو نبی آخرالزمان تسلیم کرنے اور آپ کے ساتھ آپ کی مکمل اتباع اور اطاعت کلی کا معاہدہ بھی کیا گیا ہو۔ یہ دراصل قرآن حکیم کے احکامات اور وحی الٰہی پر مبنی ٹھوس اور اساسی اُصولوں پر استوار ایک واضح نظریے اور پختہ کردار و عمل کی حکمرانی کا تصور ہے جس میں انسان اللہ احکم الحاکمین کے نائب اور خلیفہ کی حیثیت سے اللہ اور اللہ کے حبیب کے احکامات و فرامین کے تحت حکومت کا کاروبار چلاتا ہے۔ یہی ٹھوس تصور اور اساسی اُصول پاکستان کی تخلیق کی بنیاد ہے۔ رسالت محمدی ﷺ کے تحت ریاست مدینہ کی تخلیق کا اساسی مقصد اللہ کے دین الحق کو دنیا کے تمام مذاہب اور نظام ہائے زندگی پر غالب کرنا تھا تاکہ انسان ــــ خلیفۃ اللہ فی الارض ــــ اوج کمال کو پہنچ کر اپنی تخلیق کے اعلیٰ و ارفع مقصد کو پالے، انسانی معاشرہ خوف و غم سے اور ابلیسی ہتھکنڈوں سے محفوظ ہو سکے۔ بین الاقوامی منظر جنگ و جدال اور باہمی تصادم کی ہیبت و دہشت سے نجات پا سکے اور انسان پوری ذہنی پاکیزگی، قلبی یکسوئی و طمانیت سے اپنے معبود برحق کی طرف متوجہ ہو کر حق بندگی ادا کر سکے۔ یہی پاکستان کی تخلیق کا آئیڈیل اور یہی اس کی متعین منزل ہے جسے جلد یا بدیر حاصل کرنا ہے۔

(ii) روز آفرینش سے دنیا میں ہمیشہ اور ہر دور میں صرف دو ہی ملتیں موجود رہی ہیں اور قیامت تک رہیں گی۔ ایک ملت اسلامیہ، جسے اللہ خالق و مالک کائنات نے اپنی مقدس کتاب قرآن الحکیم میں ''حزب اللہ'' کے نام سے پکارا ہے اور دوسری ملت باطلہ جسے ''حزب الشیطان'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس میں کافر، مشرک، یہودی، عیسائی، دہریے وغیرہ سبھی شامل ہیں۔ اس اٹل اور ابدی سچائی پر مہر تصدیق کرتے ہوئے اللہ رب العزت ''سورۃ الکافرون'' میں فرماتے ہیں:

''اے میرے حبیب! دوٹوک الفاظ میں اعلان فرما دیجیے کہ اے اہل باطل!
میں تمہارے معبودانِ باطل کی بندگی نہیں کرسکتا اور تم میرے معبود برحق کی
بندگی کے لئے تیار نہیں ہو، اس لئے میرا اور تمہارا راستہ کبھی ایک نہیں ہوسکتا۔
(لَکُمْ دِیْنُکُم وَلِیَ دِیْنِ)''

اسی بنیاد پر ریاست مدینہ کی فلک بوس عمارت تیار ہوئی تھی اور یہی حکم خداوندی دوقومی نظریہ کی شکل میں مملکت خداداد پاکستان کی تخلیق کی بنیاد بنا اور لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کے اسی خدائی فیصلہ کے حوالے سے بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناح نے مارچ 1944ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''پاکستان کی تخلیق کی بنیاد تو اسی دن رکھی جا چکی تھی جس دن ہندوستان میں
پہلے شخص نے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ (ﷺ) کہا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات
ہے جب یہاں ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی۔
مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمہ توحید ہے وطن نہیں اور نہ ہی نسل ہے۔
ہندوستان کا جب پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں رہا بلکہ ایک
جداگانہ قوم کا فرد ہوگیا اور بت پرست ہندوستان میں توحید کی قائل ایک نئی قوم
وجود میں آ گئی۔''

اور پھر 1192ء میں عظیم مسلمان فاتح شہاب الدین غوری نے اپنے اس وقت کے مدمقابل ہندو راجہ پرتھوی راج کو اس وقت کے عام رواج کے مطابق شرائط صلح پر مشتمل جو خط لکھا تھا۔ (برصغیر کی مستند تاریخ ''تاریخ فرشتہ'' کے مطابق) اس خط میں یہ مطالبہ موجود ہے کہ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان مسلم اکثریتی آبادی کے صوبوں پر مشتمل علاقے میرے پاس رہیں گے اور باقی ہندوستان پر تم حکومت کرو۔ شہاب الدین غوری کے اس مطالبے میں بھی دوقومی نظریے کی بنیاد پر قیام پاکستان کی واضح اور صاف جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اسی سرمدی حکم خداوندی کے تحت جو احکم الحاکمین نے خود اپنے حبیب اقدس ﷺ کی ملت کے لئے ہمیشہ کے لئے مقرر کر دیا ہے، حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ نے مطالبہ کیا تھا کہ ملت اسلامیہ چونکہ اپنے

دین، اپنی تہذیب وثقافت، رسم ورواج، اپنے تشخص اور اپنی ہیبت ترکیبی میں ایک الگ ملت ہے اس لئے سرحد، بلوچستان، سندھ، پنجاب اور بنگال وغیرہ کے مسلم اکثریتی علاقوں میں مشتمل خطوں پر ایک الگ اور آزاد وطن کا حصول مسلمانوں کا ایک بنیادی حق ہے۔ چنانچہ حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کی قلندرانہ بصیرت اور قائداعظم کی فعال، بیدار مغز، ولولہ انگیز اور پرعزم قیادت اور مقصد کی سچائی اور اُصولی موقف نے نہ صرف شاطر انگیز اور مکار ہندو کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا بلکہ دنیا بھر سے اپنے موقف کی سچائی کو منوالیا اور وہ اسی قومی نظریہ کی قرآنی بنیاد پر اپنا وہ علیحدہ وطن حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے جس کا نام ''پاکستان'' ہے۔

اس دوقومی نظریہ کو ایک دوسرے زاویہ نگاہ سے دیکھئے کہ برصغیر کی تقسیم کے وقت ان علاقوں کے مسلمانوں کو جو بھارت کا حصہ ہیں اگر یہ کہا جاتا کہ پاکستان اس مقصد کے لئے بنایا جارہا ہے کہ اس پر چند گھرانوں کا تسلط قائم ہوگا۔ انہی گھرانوں کی اولادوں کو بڑے بڑے عہدے اور مناصب ملیں گے اور وہ یہاں لوٹ مار کا بازار گرم کریں گے تو وہ اپنے خون کا ایک قطرہ تو کیا اپنے پسینے کا ایک قطرہ بہانے کے لئے بھی تیار نہ ہوتے۔ بمبئی، مدراس اور مہاراشٹر کے مسلمانوں نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا، پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا، اپنی جانیں کھپائیں، اپنی بستیوں اور شہروں کو اپنے اور اپنے بچوں کے لئے جہنم بنالیا۔ صرف اور صرف اس اُمید پر کہ دنیا میں کوئی خطہ زمین تو ایسا ہو جہاں اللہ کا قانون اور اللہ کے حبیب ﷺ کی شریعت نافذ ہو، قرآن و سنت کی حکمرانی ہو، جہاں اسلام اپنی پوری شان وعظمت اور عزت ووقار کے ساتھ سر اُٹھا کر کھڑا ہوسکے اور مسلمان اپنے دین اور تہذیب وتمدن کے مطابق زندگی بسر کرنے میں آزاد ہوں، جہاں اسلامی تعلیم عام ہو اور اسلامی اخلاق وعقائد کی تربیت دی جائے۔ یہی عالمگیر جذبہ، اسلامی عقیدہ، نظریہ اور اسلامی اُصول ریاست مدینہ کی بنیاد تھی اور یہی دوقومی نظریہ کی شکل میں پاکستان کی تخلیق کا باعث بنا۔

اور اساسی عقائد ونظریات نہ جغرافیائی سرحدوں کے پابند ہوتے ہیں نہ نسبی رشتوں، قبیلوں اور خاندانی بندشوں کے، تاریخ کی گواہی ریکارڈ پر ہے کہ جب مکہ یا مدینہ میں کسی قبیلہ یا خاندان کا کوئی فرد اسلام قبول کرتا تھا تو سارے قبائلی، نسبی اور خاندانی رشتے توڑ کر ملت اسلامیہ کا

فرد بن جاتا تھا۔ بدر، اُحد اور اسلام و کفر کے درمیان لڑی جانے والی ابتدائی جنگوں میں باپ نے بیٹوں کے خلاف، بیٹوں نے باپ کے خلاف، بھائی نے بھائی کے خلاف تلوار اُٹھا کر کے لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَ لِیَ دِیْنِ کے خدائی دوقومی نظریے پر مہر تصدیق ثبت کر دی اور ثابت کر دیا کہ ریاست مدینہ کا تصور درحقیقت اسلامی نظام کے جامع اور مکمل نفاذ کا تصور تھا اور بعینہٖ اسی طرح نظریہ پاکستان بھی دراصل نظریہ اسلام ہے جو ایک مکمل و اکمل ضابطہ حیات اور بنی نوع انسان کے لئے قیامت تک ایک سرمدی آفاقی اور زندہ جاوید نظریہ زندگی ہے۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ کے یہ الفاظ اسی اجمال کی تفصیل ہیں:

> ''مسلمانوں اور ہندوؤں کی متضاد تہذیب ایک ہزار سال سے ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار ہے۔ اس لئے کہ دین اسلام اور ہندو دھرم محض دو بالکل الگ الگ اور متضاد مذاہب ہی نہیں بلکہ درحقیقت دو مختلف اور متضاد معاشرتی نظام ہیں۔ اس لئے مشترکہ قومیت کا تصور ایک خواب و خیال کے سوا کچھ نہیں''
>
> (23 مارچ 1940ء)

(iii) آقائے دو جہاں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے ریاست مدینہ میں وحی الٰہی کے تحت مسلم ملت کی تشکیل کی۔ اس ملت میں ایک طرف عالی نسل و نصب عرب شیوخ حضرت ابوبکر، حضرت عمر فاروق، حضرت حمزہ، حضرت عثمان، حضرت علی اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں تو دوسری طرف حضرت سلمان فارسی، حضرت بلال حبشی، حضرت صہیب رومی اور دوسرے بہت سے صحابی رضوان اللہ علیہم اجمعین مختلف رنگ و نسل، زبان و لباس، ملک و قبائل اور خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے مگر کلمہ طیبہ- لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ- پڑھ لینے کے بعد وہ سب حضرات ایک ملت اور ایک اُمت قرار پائے؛ اس لئے کہ وہ سب ایک دین کے پیروکار اور اسلامی اُخوت و بھائی چارہ کے بندھن میں بندھ گئے تھے۔ حالانکہ بین الاقوامی مروّجہ قوانین اور قوم کی مروجہ تعریف کی رو سے دنیا بھر کے انسانوں کی تمدن، سوچ کے کسی بھی زاویے سے انہیں ایک قوم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے کہ ان میں زبان، نسل، رنگ، ثقافت اور تہذیبی ورثے کے حوالے سے کوئی بھی قدر مشترک

نہیں تھی۔ ریاست پاکستان کا معاملہ بھی بالکل ایسا ہی ہے جہاں ساحل مکران سے لے کر پورے برصغیر میں پھیلے پٹھان، پنجابی، افغانی، سندھی، بلوچی، کشمیری، دکنی، بنگالی، ہر رنگ و نسل، زبان و ثقافت، تہذیب و تمدن کے حامل مسلمانوں نے مطالبہ پاکستان کے لئے قائداعظم کی آواز پر ہمہ تن من دھن لبیک کہا اور سب پاکستانیت کے اسلامی قومی دھارے میں شامل ہو گئے۔

(iv) جس طرح اللہ کے حبیب حضور سرور کائنات ﷺ کی پیغمبرانہ قیادت و رہنمائی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مدینہ کی پہلی اسلامی نظریاتی ریاست کے قیام کو ممکن بنانے کے لئے بے پناہ قربانیاں دینا پڑیں، بے مثال جدوجہد کرنا پڑی، مصائب و مشکلات کے پہاڑ عبور کرنا پڑے، آگ و خون کے دریاؤں سے گزرنا پڑا، ہجرت کے کٹھن مراحل طے کرنا پڑے۔ بعینہٖ اسی طرح برصغیر کے مسلمانوں کو بھی آزاد اسلامی ریاست پاکستان کے حصول کو ممکن بنانے کے لئے ایسے ہی اَن گنت، کٹھن اور صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا۔ دس لاکھ سے زائد بچوں، بچیوں، عورتوں، مردوں، بوڑھوں، جوانوں کو اپنی جانوں کی قربانیاں دینا پڑیں۔ لاکھوں عفت مآب بچیوں کی عصمتوں کی قربانی کے عذاب سے گذرنا پڑا۔ ان گنت مسلمان بچیاں اغوا ہوئیں اور دو کروڑ سے زائد مسلمانوں کو اپنے گھر بار، جائیداد، مال مویشی چھوڑ کر ہجرتوں کے کٹھن اور جان لیوا مراحل طے کرنا پڑے۔ اللہ نے اپنی کتاب مقدس قرآن مجید میں جہاد فی سبیل اللہ کے ساتھ ہجرت فی سبیل اللہ کو اسی لئے ہی تو لازم قرار دیا ہے کہ ایک مسلمان کے لئے دنیا میں نہ گھر بار اور وطن کی کوئی اہمیت ہے نہ آل اولاد، رشتہ و پیوند، قبیلہ، کنبہ اور نہ کاروبار کی بلکہ اس کے نزدیک سب سے زیادہ اہم اس کا ایمان، اس کا دین، اس کا عقیدہ اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دیے ہوئے وہ سنہرے سرمدی اُصول ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کر کے وہ اللہ کی رضا اور اس کے حبیب ﷺ کی خوشنودی حاصل کر سکے۔ وہ اپنا گھر بار، وطن، اولاد، عزیز و اقارب تو کیا اپنی جان تک کو قربان کر دینے کو اس بات پر ترجیح دے گا کہ وہ ان اُصولوں کو قربان کرے جن پر اس کے ایمان و عقیدے کا دارومدار ہے۔

(v) جس طرح ریاست مدینہ کی تخلیق سے اسلام کا آغاز انتہائی نامساعد حالات اور کسمپری

کی حالت میں ہوا تھا اور ملت اسلامیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ بالکل اسی طرح اور ویسے ہی گھمبیر اور نامساعد حالات میں (جیسا کہ کئی ایک احادیث نبویؐ سے ثابت ہے) اسلام کے احیاء اور ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا شرف اس خطہ ارضی پاکستان کو حاصل ہوگا۔ ان شاءاللہ!

(vi) مکہ میں اسلام کے فروغ ونشوونما اور پھیلاؤ کے لئے حالات سازگار نہ تھے اس لئے حضور سرور کائنات ﷺ اور مسلمانوں کو ہجرت کر کے مدینہ آنا پڑا۔ مدینہ میں اسلام کے پھیلاؤ اور عروج اور فروغ کے لئے حالات سازگار تھے اور حضور اقدس ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کی انتھک محنت، جدوجہد سے وہاں کا ماحول مزید سازگار ہوتا چلا گیا اور اسلام اپنے فطری انداز میں پھیلتا اور فروغ پاتا چلا گیا۔ بالکل اسی طرح موجودہ حالات میں پوری اسلامی دنیا میں صرف پاکستان اور اس سے ملحق افغانستان کا خطہ ہی وہ واحد خطہ ہے جہاں اس دین فطرت اسلام کی انقلابی تحریک کے پھیلاؤ، فروغ اور ثمر آوردی کے لئے مناسب ماحول اور سازگار حالات موجود ہیں۔ اس تاریخی حقیقت کے واضح اشارے ''غزوۃ الہند'' کے حوالے سے کئی احادیث مبارکہ سے بھی ملتے ہیں اور پھر مدینۃ النبی میں برپا ہونے والے اور تیزی سے پھیلنے والے اسلامی انقلاب کی طرح برصغیر کا یہ خطہ ارضی جہاں سے میر عرب ﷺ کو ٹھنڈی ہوا آئی تھی، ویسے ہی اسلامی انقلاب کے لئے نہ صرف مناسب ماحول اور سازگار حالات رکھتا ہے بلکہ اس انقلابی اسلامی تحریک کو آگے بڑھانے، اس کی مناسب دیکھ بھال کرنے، اس کی توسیع، بقاء اور اسے منطقی انجام تک پہنچانے کا مناسب سامان بھی رکھتا ہے، ضروری ٹیکنیکی، حربی اور افرادی قوت اور وسائل بھی۔

(vii) جس طرح کفار مکہ، منافقین، مشرکین، یہودی اور دیگر اسلام دشمن عناصر نے ریاست مدینہ کی تحریک اسلامی کی شدید اور بھرپور مخالفت کی تھی، بالکل اسی طرح کفار ہند، برطانوی سامراج، دنیا بھر کی اسلام دشمن طاقتوں، بھارت کے سکھوں، عیسائیوں، پارسیوں کے علاوہ خود مسلمانوں کے کچھ فعال عناصر ــــــــــ جن میں مولانا ابوالکلام آزاد کے زیر قیادت کانگریسی مسلمان، مولانا حسین احمد مدنی کی زیر قیادت جمعیت علمائے ہند، پنجاب میں زوردار

خطیبوں اور مقررین پر مشتمل مجلس احرار اسلام اور صوبہ سرحد میں سرحدی گاندھی اور اس کا خدائی خدمت گاروں پر مشتمل پر جوش عوامی کارکنوں کا گروہ۔ ان ساری طاقتوں نے متحد ہو کر تحریک پاکستان کی شدید اور بھرپور مخالفت کی تھی ــــــــــــ ان ساری مخالفتوں اور سازشوں کے باوجود ریاست مدینہ میں تحریک اسلامی بھی فروغ پاتی رہی اور عروج حاصل کیا اور اللہ کے فضل و کرم سے تحریک پاکستان بھی کامیاب رہی اور اب یہ تحریک اپنے فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہو چکی ہے جو استحکام پاکستان کی شکل میں دین اسلام کے احیاء اور ملت اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ کی منزل کے حصول کی طرف تیزی سے رواں دواں ہے۔

(viii) تخلیق کے وقت ریاست مدینہ کی کوئی جغرافیائی، لسانی، معاشی وحدت نہ تھی بلکہ توحید و رسالت اس کی اساس تھی۔ اسی طرح دنیا بھر میں سینکڑوں ممالک جغرافیائی، معاشی، تمدنی اور لسانی وحدت کے طور پر موجود تھے مگر پاکستان دنیا کے نقشے پر موجود نہ تھا۔ اس کی تخلیق بھی توحید و رسالت کی اسی فکری اور نظریاتی اساس پر ہوئی ہے۔

(ix) نہ صرف جزیرۃ العرب کے کفار و مشرکین و منافقین نے مدینہ کی نوزائدہ اسلامی ریاست کے وجود کو کبھی دل سے تسلیم نہ کیا بلکہ یہود و نصاریٰ اور دنیا بھر کی اسلام دشمن طاقتیں بھی ہمیشہ اس کی مخالف رہیں اور اسے مٹا دینے کی نت نئی سازشیں اور حربے استعمال کرتی رہیں۔ بالکل اسی طرح کفار و مشرکین و منافقین نے قیام پاکستان کو کبھی دل سے تسلیم ہی نہیں کیا اور یہ ساری دشمن طاقتیں ہمیشہ اسے مٹا دینے کی گھناؤنی سازشوں میں مصروف رہیں بلکہ دنیا بھر کی اسلام دشمن طاقتوں کا رویہ بھی پاکستان کے ساتھ ہمیشہ معاندانہ اور مخالفانہ رہا۔ اس پر تین خوفناک، ہولناک اور تباہ کن جنگیں مسلط کی جا چکی ہیں۔

(x) ریاست مدینہ کے قیام کے وقت ریاست مخالف عناصر (منافقین و فاسقین) کا ایک طاقتور اور بااثر گروہ ریاست کے اندر موجود تھا جو ہمیشہ اس اصلاحی ریاست کے مقاصد کے حصول

اورعروج وترقی کی راہ میں روڑے اٹکاتا رہا۔ پاکستان بھی اپنے قیام سے لے کر اب تک ایسی ہی تکلیف دہ صورت حال سے گزر رہا ہے۔ ملک بھر کی اسلام دشمن طاقتوں کی نسبت ہماری صفوں میں چھپے یہ اندر کے دشمن (منافقین و فاسقین) زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہیں اور گزشتہ 63 سالہ دور میں اس مملکت خداداد پاکستان کو اندر کے ان دشمنوں نے جتنا نقصان پہنچایا ہے بیرونی دشمن نہیں پہنچا سکے۔

(xi) مدینہ کی اسلامی ریاست کی تشکیل کے وقت پوری دنیا دو بڑی طاقتوں (بلاکوں) میں منقسم تھی قیصر روم کی رومی سپر پاور اور کسریٰ کی ایرانی سپر پاورز نے دنیا پر اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ ان حالات میں اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت اپنی ہمہ گیر، ہمہ جہت، وسیع الخیال، وسعت پذیر اور انسان دوست تحریک اور پالیسی کے ذریعے ان دونوں سپر پاورز کو چیلنج کیا اور نصف صدی کے اندر اندر دونوں عالمی طاقتوں کی اجارہ داری ختم کر کے انسانیت کو ان کے ظلم وستم سے نجات دلا کر آزادی کی نعمت سے مالا مال کر دیا۔ اسلامی ریاست پاکستان کے قیام کے وقت بھی حیرت انگیز طور پر دنیا کو ویسی ہی صورت حال کا سامنا تھا پوری دنیا کسی نہ کسی انداز میں امریکہ (امپریلزم-IMPERIALISM) اور روس (کمیونزم-COMUNISM) دو بلاکوں میں بٹی ہوئی تھی اور انہی دو سپر پاورز کی ساری دنیا پر اجارہ داری قائم تھی۔ اسلامی ریاست پاکستان نے انہیں دو انتہاؤں کے درمیان اپنی مضبوط ساکھ قائم کی۔ جس طرح قیصر روم نے اپنی سپر پاور ہونے کے زعم میں مدینہ کی اسلامی ریاست کو چیلنج کرنے کی حماقت کی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس ابھرتی ہوئی اسلامی مدافعتی طاقت کے ہاتھوں خود پاش پاش ہو گیا۔ بالکل اسی طرح روسی سپر پاور نے افغانستان پر حملہ کر کے نہ صرف پاکستان بلکہ پوری اسلامی دنیا کو معرض خطر میں ڈالا تو پاکستان، افغانستان اور پورے عالم اسلام کی اسی اسلامی جہادی مدافعتی قوت نے چند برس کے قلیل عرصہ میں افغانستان کی سرزمین پر اس حملہ آور سپر پاور کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا۔ دوسری سپر پاور امریکہ اور اس کے نیٹو اور بھارت اتحادی (امپریلزم) 2001ء میں افغانستان پر حملہ کر کے رشین سپر پاور والی حماقت دہرانے کی غلطی کا ارتکاب کر چکی ہے اور اب اسلام کی اسی عالمگیر مدافعتی جہادی قوت

کے شکنجے میں جکڑی پھڑ پھڑا رہی ہے اور افغانستان اور پاکستان کی اسی سنگلاخ سرزمین پر رشین سپر پاور والے عبرت ناک انجام کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ان شاءاللہ!

(xii) جس طرح مدینہ کی اسلامی ریاست کی تخلیق کا اساسی مقصد محض جغرافیائی خطہ زمین کا حصول نہ تھا بلکہ ایک ہمہ گیر، ہمہ جہت، وسیع الخیال، وسعت پذیر اور انسانی فلاح پر مبنی اُصولی سوچ اور اللہ رب العالمین کے نازل کردہ اس اعلیٰ وارفع منشور حیات اور تکمیل انسانیت کے مقصد کی تکمیل کا نقطہ آغاز تھا اور وہ عظیم، عالمگیر، ہمہ گیر اور وسعت پذیر منشور حیات اور مقصد تھا اللہ احکم الحاکمین کا یہ اٹل سرمدی، زندہ جاوید اور ناقابل تغیر امر کہ (DIVINE WORLD ORDER) "وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ" یعنی دنیا بھر کے باطل اور تحریف شدہ ادیان و مذاہب اور طرز ہائے حیات کو باطل کر کے اللہ رب العالمین اور اللہ کے حبیب رحمۃ للعالمین کی اطاعت و اتباع کلی پر مبنی دین الحق دین اسلام کا دنیا بھر میں نفاذ اور مکمل غلبہ۔ اور پھر یہ عظیم، وسعت پذیر، بین الاقوامی مقصد اور منشور حیات نصف صدی سے بھی کم عرصہ میں خلافت اسلامیہ (اسلامک سپر پاور ISLAMIC SUPER POWER) کی شکل میں دنیا نے تکمیل پذیر ہوتے دیکھا۔ اسلامی فلاحی ریاست پاکستان کی تخلیق کا بنیادی اور اساسی مقصد بھی اسی عظیم، ہمہ گیر، عالمگیر، وسعت پذیر منشور حیات اور امر الٰہی (DIVINE WORD ORDER) کی تکمیل ہے جو چند صدیوں کی ابتدائی کامیابیوں اور کامرانیوں کے بعد مسلمان حکمرانوں کے راہ راست سے بھٹک جانے، نا اہلی، باہمی چپقلش اور اس مقصد عظیم کو پس پشت ڈال دینے کی وجہ سے ادھورا رہ گیا تھا اور دنیا کے ایک بڑے حصے تک اس کی سرمدی فلاحی برکات نہ پہنچنے پائی تھیں۔

اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے پاکستانی حکمرانوں، پیشوایان ملت اور دوسرے ذمہ دار طبقوں پر جو اہم ذمہ داری عائد ہوتی تھی اسے انہوں نے نظر انداز کیا مگر اب اس کی اہمیت کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے اور وہ ذمہ داری یہ تھی اور ہے کہ وہ صحیح تعلیمی پالیسی اور دیگر ذرائع اور وسائل کے استعمال سے یہ بات ہر پاکستانی خاص طور پر نئی نسل کے ذہن نشین کرائیں کہ پاکستان کی تخلیق کے دو بنیادی مقاصد تھے اور ہیں ایک داخلی (INTROVERT) اور دوسرا خارجی

(EXTROVERT) اس کی تخلیق کا داخلی مقصد قوم پرستانہ سیاست، گروہی سیاست، حقوق کی سیاست، مفادات کی سیاست اور طبقاتی تقسیم کے مہلک تعصّبات کے ذریعے نیشنلزم اور مائیکرو نیشنلزم کو پروان چڑھانا ہرگز ہرگز نہ تھا اور نہ اس کا مقصد لوٹ گھسوٹ، رشوت خوری، جیبیں بھرنا، جائیدادیں بنانا، اقرباء پروری تھا اور نہ بلوچی، بنگالی، پنجابی، پشتو، سندھی، کشمیری کی سیاست کے ذریعے طبقاتی تقسیم اس کا مقصد تھا بلکہ اس کا اندرونی اور داخلی مقصد اس کے سارے یونٹوں میں بسنے والے لوگوں کو ایک متحدہ مسلم قومیت کے قالب میں ڈھال کر اسے ایک تجرباتی نمونہ بنانا اور پھر پوری ملت اسلامیہ کے اتحاد کے لئے ایک تجرباتی نمونہ (پاکستان) کو ایک مثالی، آئیڈیل اور مضبوط مرکز کے طور پر پیش کرنا تھا اور ہے اور پھر اس مضبوط مرکز سے ایک ہمہ گیر، وسعت پذیر، بین الاقوامی خارجہ پالیسی (EXTROVERT POLICY) کے تحت پاکستان کی تخلیق کا دوسرا اعلیٰ وارفع مقصد یعنی پوری ملت اسلامیہ کو ایک متحد، مضبوط اور مستحکم ملت واحدہ بنا کر "وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ" کے ادھورا رہ جانے والے کام کی تکمیل تھا اور ہے۔ بانئ پاکستان حضرت قائداعظم کا یہ دوٹوک اور واضح اعلان کہ:

> "میں پاکستان کو اسلام کی ایک لیبارٹری بنانا چاہتا ہوں جہاں سے سارے عالم اسلام کی رہنمائی کی جائے گی۔"

اس کھلی حقیقت کا اظہار اور اس ادھورا رہ جانے والے اصل کام کی تکمیل کی منزل کے حصول کے عزم صمیم کا اظہار ہے۔ گویا پاکستان کی تخلیق کا اہم مقصد پوری ملت اسلامیہ کو انتشار و فرقہ واریت کے بھنور سے نکال کر ایک مضبوط مرکز پہ متحد کر کے اسے مرکزیت عطا کرنا تھا اور ہے۔ رہبر و مرشد کامل حضرت ابوانیس محمد برکت علیؒ کا ارشاد ہے:

> "اللہ کرے مسلمان پھر سے متحد ہوں اور عالمگیر اسلامی اتحاد ہو۔ دنیائے اسلام کے تمام مسلمان ایک مرکز پہ متحد ہو کر غالب ہوں اور یہ غلبہ سرمدی ہو، سدا قائم رہے آمین!"

مگر ہمارے حکمرانوں اور سیاست دانوں کی گروہی، مفاد پرستانہ، قوم پرستانہ طبقاتی اور حقوق کی سیاست اس ہمہ گیر، عالمگیر اور وسعت پذیر اسلامی ملّی سوچ اور اعلیٰ وارفع مقصد کے حصول میں ابھی تک رکاوٹ بنی ہوئی ہے اور متحدہ ملت واحدہ کی تشکیل کا یہ اہم ترین کام ابھی تک

تشنہ تکمیل ہے۔حضرت علامہ اقبال اور حضرت قائداعظم کے اس اتحاد ملت کے پختہ اور بے لچک نظریہ کا ہی سحر تھا کہ تحریک پاکستان کے دوران برصغیر کے ہر خطہ کے مسلمان' سندھی، بلوچی، پنجابی، پٹھان، بنگالی، کشمیری، افغانی، دکنی، مدراسی، مہاراشٹری کی کوئی تمیز باقی نہ رہی تھی۔سب ملت واحدہ کے قالب میں ڈھل کر مسلم لیگ کے جھنڈے کے تلے جمع ہو گئے تھے اور ہر قسم کے گروہی اور علاقائی تعصب اور سارے فروعی اختلاف مٹ گئے تھے۔ 1946ء میں ایک مصری صحافی نے حضرت قائداعظم سے سوال کیا:

''جمہوریت کی روح کے منافی آپ ایک مسلمان اقلیت کے لئے کس بنیاد پر علیحدہ وطن کا مطالبہ کر رہے ہیں؟''

حضرت قائداعظم کا جواب تھا:

''میں نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کے لئے پاکستان کا مطالبہ کر رہا ہوں نہ پاکستان بنانا چاہتا ہوں بلکہ میں تو دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے یہ ملک (اسلام کی تجربہ گاہ) بنا رہا ہوں۔دنیا کے نقشے کو دیکھو! اگر آج پاکستان نہیں بنتا تو مصر سے لے کر یورپ تک سارا علاقہ ایک ہندو اسٹیٹ بن جائے گا۔''

اور سلطان جہاں حضور بابا جی سرکار حضرت ابوانیس محمد برکت علیؒ نے دین اسلام کے احیاء، دنیا بھر پر غلبے اور ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے اس ادھورے کام کی تکمیل کو ملی اتحاد سے مشروط کیا ہے:

''دین اسلام۔اللہ کا پسندیدہ دین۔کائنات کی سب سے بڑی سچائی۔ایک امانت ہے اللہ تعالیٰ اور سرور انبیاء ﷺ کی طرف سے اور ہم سب اس کے امین ہیں۔یہ دین ایک برادری کی تشکیل کرتا ہے، ایک ایسی برادری جو خالق کائنات کی فرمانبردار ہے، جو کرہ ارض پر امن وسکون، حق وانصاف اور سچائی کی علمبردار ہے۔اس برادری کے ڈیڑھ ارب افراد اخوۃ کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں، یہ اخوۃ کا رشتہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حضور سرور کونین ﷺ کا قائم کیا ہوا ہے، اس رشتہ کے مقابلے میں باپ، بیٹے، بہن، بھائی ایسے تمام رشتے کچے دھاگے کی مانند ہیں۔ڈیڑھ ارب مسلمان اور رشتہ اُخوت ــــــــــ یہ ہے ملت اسلامیہ۔حق وانصاف کی علمبردار۔مگر آہ! یہ

مرکز سے دور کیوں ہے؟ یہ انتشار کیا ہے؟ یہ جدائیاں کیوں ہیں؟ یہ خرابیاں کیسی ہیں؟ یہ سب ایک کیوں نہیں؟ ان کے درمیان یہ مصنوعی دیواریں کیسی ہیں؟ ملت کا ہر فرد، اسلام کا ہر فرزند جواب دے کہ ان دیواروں کو کون منہدم کرے گا؟ ان مصنوعی فاصلوں کو کون ختم کرے گا؟

ہے کوئی جمال الدین افغانی؟

ہے کوئی صلاح الدین ایوبی؟

ہے کوئی محمد بن قاسم؟

سامنے آؤ! ملت کو آج تمہاری ضرورت ہے!

حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سلطنت تقریباً بیس لاکھ مربع میل رقبہ میں پھیلی ہوئی تھی اور یہی اُس وقت کی کل دنیائے اسلام تھی۔ مسلمانوں کے اتحاد کی برکت سے تمام روئے زمین کے فرمانروا اس کے باج گزار تھے۔ مگر آج تقریباً ساٹھ اسلامی سلطنتوں کے زیر اقتدار ممالک کا مجموعی رقبہ تقریباً ڈیڑھ کروڑ مربع میل سے متجاوز ہے اور نفاق کے باعث ہم مشرق وسطیٰ کے سب سے چھوٹے ملک اسرائیل سے خائف ہیں۔ یہ حال ہے اس ملت کا جس کی حکومت کرہ ارض کے تین بڑے براعظموں میں پھیلی ہوئی ہے اور جس کی ہیبت سے روم کے قیصر اور ایران کے کسریٰ لرزہ براندام تھے۔ آہ! آج اس کی بے چارگی پر ترس آتا ہے ــــــــــــ یہی تو ہے وہ ملت جس کا ہر فرد عظمت کا مینار اور انسانیت کا جوہر تھا، جس کی پیشانی کی سلوٹیں تاریخ کے نئے باب کا عنوان بن جایا کرتی تھیں! مگر کیا آج انہیں کے ہاتھوں اپنے ہی اُصولوں کی دھجیاں نہیں اُڑ رہی ہیں؟

ہمیں ایک زندہ قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے جو نیل کے ساحل سے لے کر کاشغر تک بیدار ہو، جو مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک ایک ہو، جس کا ہر فرزند چوکس ہو اور جہاں اُخوت کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہو، تو

مسلم نوجوانو! اُٹھو!

اپنی صلاحیتوں سے کام لو!
اپنی قوت بازو کو کام میں لاؤ!
اپنی قوت ارادی سے مغربی تہذیب کو ٹھکرا دو!
اپنی ہمت سے انتشار و افتراق کے دروازے بند کر دو!
اپنے کردار کی عظمت اور سچائی سے اپنی دیرینہ روایات کو زندہ کر دو!
اپنے اخلاق و اخلاص سے اُخوت کے شجر کی آبیاری کرو!
اپنی تدبیر و فراست سے دنیا بھر کے مسلمانوں کو متحد کر دو!
تہذیب اسلامی کی شمعیں جلاؤ کہ تہذیب مغرب کی آنکھیں چندھیا جائیں!
مسلم نوجوانو!
نکلو! پندرھویں صدی ہجری کی سب سے بڑی اور سب سے اہم جدوجہد میں مصروف ہو جاؤ۔ آج تمہاری مسجدیں غیر آباد ہیں کچھ کرو کہ تمہاری مسجدیں، تمہاری قومی تنظیم کے مرکز بن جائیں! تمہاری اذانیں بے اثر ہیں، دعا کرو کہ یہ تمہارے قلب کو بھی گرمائیں، تمہارے معاشرے میں خرابیاں ہیں۔ ایک نئے معاشرے کی بنیاد رکھو جہاں انسانی شرف کا پیمانہ زر کی بجائے تقویٰ ہو۔ روح بلالی پیدا کرو کہ کرۂ ارض پر اذان بلالی بلند ہو اور اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین، سرور کائنات ﷺ کا پیارا دین، دین اسلام یورپ کی وادیوں میں، افریقہ کے صحراؤں میں غرضیکہ ہر جگہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غالب ہو جائے۔ آمین!

اللہ کا خصوصی انتخاب

نہ صرف یہ مملکت خداداد پاکستان بلکہ پاکستانی قوم اور اس سے ملحق افغانستان اور افغان قوم "الحکم لله الملك لله" کے مصداق اللہ اور اللہ کے حبیب ﷺ کا ایک خصوصی انتخاب ہے، عطا ہے، یہ سرتاپا روحانیت ہے، اس کا خمیر قومیت یا وطنیت کے محدود پیمانے سے نہیں اُٹھایا گیا بلکہ یہ تو اسلام کے آفاقی، ہمہ گیر اور وسعت پذیر نظریہ ملت واحدہ کی علمبردار ہے حضور سرور

کائنات ﷺ نے اپنی زبان حق ترجمان سے جب ''ہند سے ٹھنڈی ہوا'' کا ذکر فرمایا تھا تو وہ ذکر مبارک نہ صرف پاکستان کی تخلیق کی واضح بشارت تھا بلکہ دین الحق کے احیاء اور ملت اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ کی اٹل پیش خبری بھی تھی اور آپ سرکار ﷺ کی وہ ''بشارت'' دنیا بھر کی ابلیسی طاقتوں کی بھرپور مخالفت کے باوجود وجود میں آچکی ہے اور اب وہ ساعت سعید بھی آن پہنچی ہے جب حضور پاک ﷺ کی اس بشارت (پاکستان) کو دین اسلام کے احیاء اور ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے کٹھن اور صبر آزما مراحل سے گزر کر، ملت واحدہ کے قالب میں ڈھل کر دنیا کی امامت کا فریضہ سرانجام دینا ہے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، شجاعت کا، عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام پھر دنیا کی امامت کا

(اقبال)

انقلاب بذریعہ تعلیم! کونسا انقلاب؟ کیسی تعلیم؟

عبدالرشید ارشد

انقلاب کا لفظ کانوں سے ٹکراتے ہی آنکھوں کے سامنے چہار سو بہتے خون اور بکھرے لتھڑے لاشے ناچتے ہیں۔ اگر یہ نہیں تو پھر کم از کم ملکی سطح پر ہر چیز تہ و بالا تو ضرور دیکھنے کو ملتی ہے مثلاً پاکستان کے پُرامن انقلابوں کا پہلا حملہ آئین پر ہوتا تو دوسرا اسمبلیوں پر اور ملکی قانون کی جگہ مارشل لا ضابطہ نمبر فلاں اور فلاں قوم کی تقدیر بدلنے کے لئے آگے بڑھتا دیکھا گیا۔

ماضی کی ایک دو صدیوں میں دنیا نے انقلابِ روس اور انقلابِ فرانس دیکھا۔ امریکی عوام نے بھی انقلاب انجوائے کیا مگر تاریخ میں ساڑھے چودہ سو سال قبل رونما ہونے والا ایک انقلاب بھی محفوظ ہے۔ یہ انقلاب اپنی نوعیت کا انوکھا انقلاب تھا اس انقلاب نے اپنا سفر بڑی دھیمی رفتار سے طے کیا تھا۔ لہو اس انقلاب کی جڑوں میں بھی تھا مگر تھا کم لیکن انتہائی قیمتی تھا صاحب انقلاب یا قائد انقلاب نبی آخر الزماں ﷺ تھے جنہوں نے 23 سالہ تدریجی جد و جہد سے انتہائی بگڑے معاشرے کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ انقلاب کے ابتدائی ایام میں چند صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے پاکیزہ لہو سے انقلاب کی راہ ہموار کی۔ ہجرت کے بعد دس سالہ دورِ غزوات میں کم پیش 234 افراد کا دونوں جانب سے خون بہا جس کے نتیجے میں خطہ عرب میں کامیاب انقلاب آیا۔

اس انقلاب کی بنیاد یقیناً حکیمانہ تعلیم نے رکھی اور اسی نے اسے مستحکم کرتے اس انقلاب کو خطہ عرب سے باہر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت تک کم پیش 34 لاکھ مربع میل علاقے تک پہنچایا اور اسے وہاں کی آبادیوں نے ہم مذہب حکمرانوں کے مقابلے میں امن و سلامتی کا ضامن قرار دیتے دل و جان سے قبول کیا۔ یقیناً یہ انقلاب بذریعہ تعلیم و کردار تھا اور جب تک اس بنیادی تعلیم کے اثرات ہر سطح پر عوام و حکمرانوں کے قلب و ذہن پر پختہ رہے یہ انقلاب مؤثر رہا مگر

قلوب واذہان پر جوں جوں زنگ چڑھتا گیا یہ ختم ہوتا گیا۔

آج اسلامی جمہوریہ پاکستان میں کئی قسم کے انقلابات کے نعرے لگ رہے ہیں یہ نعرے سیاستدان اور حکمران لگاتے ہیں کوئی نعرہ لگاتا ہے کہ ہم اس ملک میں سبز انقلاب لائیں گے تو کسی کا نعرہ ہے کہ ہم صنعتی انقلاب لائیں گے، کوئی سماجی ومعاشرتی انقلاب لانے کا دعویدار ہے۔ دور کھڑا انقلاب حیران وششدر سب کا منہ تک رہا ہے۔ ماضی میں ہمارے سیاستدانوں کا تکیہ کلام تھا کہ ''جال بچھا دیں گے''، کوئی کہتا سڑکوں کا جال بچھا دیں گے تو کوئی نہروں کا جال بچھاتا، وزیر جیل خانہ جات بھی جلال میں آ گئے فرمایا ہم ملک میں جیلوں کا جال بچھا دیں گے۔

انقلاب کے حوالے سے تمہیدی کلمات کے بعد سوال سامنے آتا ہے کہ ہمارے حکمران کس قسم کے انقلاب کے خواہاں ہیں۔ وہ سبز انقلاب بذریعہ تعلیم لانا چاہتے ہیں یا ان کے پیش نظر صنعتی انقلاب ہے، وہ مہنگائی کے حق میں انقلاب کی بات کرتے ہیں یا مہنگائی کے خلاف اس کی کمر توڑنے والے انقلاب کے خواہش مند ہیں، یا وہ سماجی ومعاشرتی انقلاب لانا چاہتے ہیں۔ سماجی ومعاشرتی انقلاب کے بھی دو پہلو ہیں ایک بقول ان کے ''بنیاد پرست'' سماج ومعاشرہ ہے تو دوسرا مادر پدر آزاد روشن خیال سماج ومعاشرہ ہے۔ دونوں طرح کے معاشروں کے انقلابی تقاضے مختلف ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ دونوں ہر دور میں ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑے دیکھے گئے ہیں۔

ایک نعرہ جو بظاہر وزنی ہے وہ انقلاب بذریعہ تعلیم ہے۔ سننے والا یہ نعرہ سنتے اپنے آپ کو ایک دوراہے پر کھڑا پاتا ہے۔ اس کی سوچ اسے الجھاتی ہے کہ تعلیم اگر مسجد ومکتب کی ہے تو صرف ''متعصب بنیاد پرست'' پیدا کرے گی جو ہر طرح کی ترقی سے غافل اپنے حال مست رہیں گے، سماج ومعاشرہ آگے سفر کے بجائے پیچھے کی سمت سفر نہ بھی کرے تو ایک ہی مقام پر جامد ہوگا۔ اگر تعلیم سکول وکالج جیسے جدید تعلیمی اداروں میں ہوگی تو اسلامی اخلاق وکردار مفقود ہوگا، ماڈرن ازم دَر آئے گا تو ہر شعبہ زندگی کے لیے مطلوب اخلاق وکردار کی اعلیٰ اقدار ساتھ چھوڑ جائیں گی۔ امریکہ ویورپ کی مثال سامنے ہے۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں انقلاب بذریعہ تعلیم نعرے کی حد تک تو درست ہے مگر ماضی کے 63 سال کا تجربہ ہر ذی شعور کے سامنے ہے کہ انقلاب اور تعلیم دونوں ہی مفاد پرست

حکمرانوں کی ضربِ شدید سے نڈھال بلکہ قریب المرگ ہیں۔ حقیقی انقلاب کے لیے جس تعلیم کی ضرورت ہے اس تعلیم کا بنیادی عنصر وہ حقیقی اور نا قابل تبدیل و تقسیم علم ہے جو اللہ تعالیٰ نے خالق ہونے کے ناتے اپنی مخلوق کے لیے اپنے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے ودیعت فرمایا اور جس کی تکمیل اپنی آخری کتاب قرآن حکیم اور اپنے آخری نبی ﷺ کے ذریعے فرمائی۔ اس علم کو آئندہ نسلوں میں پہنچانے والی تعلیم حقیقی انقلاب کا موجب بن سکتی ہے۔ بدنصیبی کی بات تو یہ ہے کہ جونہی قرآن وسنت کے حوالے سے علم اور تعلیم کی بات کسی زبان سے نکلتی ہے تو ''بنیاد پرستی'' اور ''مذہبی انتہا پسندی'' کا کالا کلوٹا بے ہنگم جن دل و دماغ میں ناچنے لگتا ہے جبکہ روشن خیالی عیش طرازی کے ساتھ سڑک کے بیچوں بیچ گاتی ناچتی ہر کسی سے داد کی طلبگار ہوتی ہے۔

تعمیری انقلاب کے لیے جس علم اور جس تعلیم کی ضرورت ہے اس کی عمارت چار ستونوں پر گہری بنیاد پر استوار مطلوب ہے۔ پہلا ستون حقیقی ماخذ کے ساتھ علم یا نصاب ہے۔ دوسرا ستون اس علم کو آگے منتقل کرنے والا ایسا معلم ہے جس کے قول و فعل اور اخلاق و کردار سے اس حقیقی علم کی خوشبو آئے۔ تیسرا ستون والدین کہلوانے والا طبقہ ہے جس کے شب و روز بچے کے تدریسی نصاب اور معلّم کی محنت کی پشت پناہی کریں یعنی گھر کا ماحول علم اور تعلیم سے مطابقت رکھتا ہو۔ چوتھا ستون میڈیا اور سماج و معاشرہ ہے جس کی معاونت مثبت نتائج کی ضمانت دے گی۔

مذکورہ چار عناصر ہوں تو ان پر انقلاب کی چھت ہر بُرے وقت سے قوم و ملک کی حفاظت کرتی ہے۔ ہماری سوچ کہ جونہی قرآن وسنت کے تابع علم و تعلیم کی بات کرتے ہیں فوراً مولوی اور مدرسہ دل و دماغ میں گھوم جاتا ہے حالانکہ قرآن وسنت کے تابع زراعت وصنعت، سائنس و طبّ، تسخیر کائنات و ارضیات' غرض ہر قسم کا علم فلاح انسانیت کے لیے موجود ہے۔ مسلمان علماء و محققین نے اسے عملاً ثابت کیا ہے اور یورپ نے اسی علم کی خوشہ چینی سے فیض حاصل کیا جس کے آج ہم مداح ہیں۔ علم کا کونسا شعبہ تھا جسے قدیم مسلمان علماء و سائنسدانوں نے تشنہ چھوڑا، بدقسمتی تو یہ رہی کہ ہم نے وارث ہونے کا حق ادا نہ کیا۔

بدنام کیے جانے والے دینی مدارس کا اپنا ایک اعلیٰ و ارفع مقام تھا، آج دین جس حال میں بھی باقی ہے اگرچہ اس میں بہت کچھ ملاوٹ بھی ہو چکی ہے جس کے بہر حال ہم ہی ذمہ دار

ہیں، انہی دینی مدارس کی محنت کا مرہونِ منت ہے۔ ہم دشمن کی چال نہ سمجھ سکے اور فروقوں، گروہوں، تنظیموں میں تقسیم در تقسیم ہو کر دشمن کے DEVIDE AND RULE فارمولے پر بڑے اخلاص سے، بڑی مستعدی سے عمل میں مصروف رہے۔ آج ہماری دینی درسگاہیں جہاں قرآن و حدیث اور فقہ کے درس دیتی ہیں وہاں سب سے پہلی ترجیح اہلحدیثیت، دیوبندیت، بریلویت، جعفریت اور نہ جانے کس کس ذیلی گروہ کی دی جاتی ہے۔

حقیقی علم کے سوتے خشک کرنے میں ہمارے دشمنوں کی محنت اور منصوبہ بندی تو سمجھ میں آتی ہے مگر اپنے کہلوانے والوں نے ہر دور میں جو گل کھلائے ہیں ماتم تو ان کا کیا جانا لازم ہے۔ علم کبھی آغا خانیوں کے سپرد کیا گیا تو کبھی یہ امریکی امداد کا محتاج ٹھہرا حالانکہ دونوں کی اصل ایک ہی ہے جس کا واضح ثبوت ریکارڈ پر ہے کہ تعلیمی بورڈ آغا خان فاؤنڈیشن کے سپرد ہوتے ہی ورلڈ بنک اور امریکی حکومت نے الگ الگ کروڑوں ڈالر کی امداد سے آغا خانیوں کو نوازا۔ آج پھر پنجاب کی حد تک تعلیمی بہتری کے لیے امریکہ نے معاہدہ کیا ہے، معاہدے کی تفصیل تو سامنے نہیں ہے مگر ظاہر ہے یہ تعلیم امریکہ کی مرضی کی ہوگی۔

پہلا ستون نصاب تعلیم ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے بانی قائداعظم محمد علی جناح نے تقسیم ہند سے قبل بارہا اور حصول آزادی کے بعد بھی بار بار برملا اس حقیقت کو ہر کس و ناقص کے سامنے رکھا کہ اس آزاد مملکت کا آئین و دستور قرآن وسنت کی بنیاد ہوگا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان ایک نظریاتی اسلامی مملکت ہوگی۔ ظاہر ہے کہ نظام تعلیم قرآن وسنت کی نظریاتی حدود میں مرتب ہونا لازم تھا تاکہ نظریاتی تعلیم سے نظریاتی قوم بنے اور پھر یہ نسل مملکت خداداد کی نظریاتی سرحدوں کی پاسداری کا حق ادا کرے کہ استحکام ملک وقوم کی یہی کنجی ہے، یہی خوشحالی کا راستہ ہے۔

نصاب تعلیم کے حوالے سے بانی پاکستان کے فرامین اور خواہشات کے برعکس ہوا یہ کہ ہر دور کی حکومت نے چن چن کر نصاب تعلیم سے اسلام اور اسلامی اخلاق و کردار کے کانٹے نکالنے کا موقع ضائع نہیں کیا دنیا جہاں کی لایعنی کہانیاں اور بے مقصد اسباق تو انگریزی، اردو کی کتب میں شامل کیے مگر طلبا و طالبات کی کردار سازی کے حوالے سے نصاب میں کچھ بھی قابل قدر نہ چھوڑا۔ مثلاً سورہ توبہ نکال دی گئی کہ بچے کل کلاں جہادی دہشت گرد نہ بن جائیں۔ طلبا و طالبات

کے کچے اذہان وقلوب میں سورۂ یوسف کے ذریعے روشن خیال معاشرے کی تشکیل کا سامان کیا کہ معلم اور معلّمات جب ''قالت حیت لك'' کی تشریح کریں گے روشن خیالی دَر آئے گی۔

بچے کے اخلاق وکردار کی تعمیر میں جہاں اساتذہ، والدین اور میڈیا کے صاف ستھرے کردار کو بنیادی اہمیت حاصل ہے وہاں نصاب ان سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ دشمن قوتوں کا سارا زور اسی راستے ملت مسلمہ بالعموم اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے 18 کروڑ عوام کو ''بنیاد پرستی'' کی طرف لے جانے والے نصاب سے بچانے پر صرف ہو رہا ہے۔ یہ نصاب پرائمری یا مڈل کا ہو، میٹرک، ایف اے یا بی اے اور ایم اے کا ہو بلکہ پلے گرپ اور نرسری تک کا بھی۔ تاکہ سیڑھی کے سب سے نچلے ڈنڈے سے شروع ہوا نتہائی آخری ڈنڈے تک پہنچتے پہنچتے یہ مکمل طور مہذب وروادار پاکستانی شہری بن جائیں، قرآن وحدیث کی تشریح وتفسیر پھر اس حاصل کیے گئے جدید علم کی روشنی میں کریں بنیاد پرستی اور اسلامی دہشت گردی کا خاتمہ خود بخود ہو جائے گا۔

نصابِ تعلیم بھاری بستہ کا نام نہیں ہے کہ علوم کا بوجھ طالب علم کے بوجھ سے تجاوز کر جائے جیسا کہ آج کل ہر خاندان دیکھ رہا ہے بلکہ بھگت بھی رہا ہے کہ بچہ سکول بیگ اٹھا نہیں سکتا اور والدین اس میں رکھی کتب کا بل ادا کرنے کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہیں۔ یہ محض تہمت نہیں ہے برسوں سے ہر اس شخص کا عملی تجربہ ہے جس کا بچہ بچی سکول جا رہا ہے کتب کی بھرمار کا اثر کاپیوں پر بھی پڑتا ہے کہ ہر مضمون کے لیے ایک ایک کاپی تو ناگزیر ہے، کتب وکاپیوں کے ماہانا بل والدین کی ہمت سے باہر ہیں۔

نصابِ تعلیم میں قومی زبان کو بنیاد بنانے والی قوم کبھی قومی حمیت وغیرت کے حوالے سے بانجھ نہیں رہتی، طلبا کا تعلیمی معیار بھی متاثر نہیں ہوتا۔ دوسری ہر زبان جاننا اس پر عبور حاصل کرنا نہ اخلاقاً ممنوع ہے نہ ہی شرعاً اس پر کوئی قدغن ہے مگر اس کی تدریس ابتدا کے بجائے وسط سے شروع کی جائے اور وہ بھی صرف ایک اہم مضمون کی حد تک۔ پہلی جماعت سے انگریزی بلکہ انگلش میڈیم کا بخار نظریاتی قوم کی تشکیل وتعمیر کی ضمانت نہیں بن سکتا۔ ماضی کا ریکارڈ گواہ ہے کہ مادری زبان میں ٹاٹ سکولوں کے طلبہ نے جو تعلیم حاصل کی وہ ان کی صلاحیتوں کو نکھارتی ہی رہی۔ ہمارے قابل قدر ماضی کے لیڈر اور بیوروکریٹ کسی سے کم صلاحیتوں کے مالک نہ تھے۔ یہ الگ

بات ہے کہ کچھ انگریز کے ہتھے چڑھ کر خراب ہوئے۔

نصابی کتب کی تدوین میں اگر حب الوطنی اور اسلامی نظریہ حیات سے مخلصانہ لگاؤ کا خیال رکھا جائے تو اردو اور انگریزی کی کتب میں کتّے بلّی یا جم جیک کی بے معنی اور بے مقصد کہانیاں پڑھانے کے بجائے اخلاقی اسباق، اسلامی طرز زندگی کے مختلف پہلوؤں پر طلبا و طالبات کی تدریس ہوسکتی ہے کہ وہ زبان دانی کے ساتھ اسلامیات، تاریخ، بلکہ ابتدائی کلاسوں میں سائنسی معلومات تک رسائی حاصل کرلیں۔ اردو انگریزی کتابوں میں سوشل سٹڈیز کے اسباق بڑی خوبی سے سموکر مضامین اور کتب کی تعداد کم کی جاسکتی ہے۔ ریاضی، سائنس، کمپیوٹر، عربی کتب بے شک الگ ہوں اگرچہ اردو اور انگریزی میں بھی کمپیوٹر کے اسباق سموئے جاسکتے ہیں۔ نصاب تعلیم کیلئے اسلامی نظریہ حیات پر مخلصانہ دسترس رکھنے والی ٹیم ہی یہ خدمت سرانجام دے سکتی ہے۔

تعلیمی انقلاب کے حوالے سے دوسرا اہم ستون معلم و معلّمہ ہے۔ فوجی اصطلاح میں عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ: THOUGH THE GUN IS IMPORTANT BUT MAN BEHIND THE GUN IS MORE IMPORTANT (اگرچہ بندوق کی اہمیت مسلّمہ ہے مگر بندوقچی بندوق سے زیادہ اہم ہے) کہ بندوق کا درست استعمال کر کے مطلوبہ نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ معلم و معلّمہ کی اپنی تربیت جس پر نہ ہوئی ہوگی ان کے شاگردوں کے اخلاق و کردار بھی ویسے ہی ہوں گے۔ یہ بات بھی تجربہ کی بنیاد پر کہا جارہی ہے اور اسے جھٹلانا بہت ہی مشکل ہے۔ 63 سالہ تعلیمی پالیسیوں نے اساتذہ کی نظریہ پاکستان کی اساس پر تربیت نہ ہونے دی۔

ماضی کو چھوڑیئے گزرے دنوں میں اساتذہ کی تربیت کے لئے امریکہ کی امداد میں اس تربیتی نصاب و ماحول کا تصور کیجیے وہاں سے تربیت یافتگان کیا واپس آ کر اسلامی نظریہ حیات کی تعلیم دیں گے؟ وہ روشن خیالی کے علمبردار بن کر آئیں گے، روشن خیال معاشرہ تشکیل دینے کے لیے نوجوانوں کو تیار کریں گے کہ دورِ نو کے تقاضے یہی ہیں یہ بات بھی محض الزام نہیں آج ملک میں شعبہ تعلیم سے متعلق اداروں کی بھرمار ہے۔ گروپ آف کالجز، چین آف سکولز کے اشتہارات سے روز ناموں کے پورے صفحات عوام کو متوجہ کرتے ہیں پہلی دس پوزیشنوں کی چمک دمک کا بھی ہر

ادارہ دعویدار ہے۔ یہ سب کچھ درست ہی ہوگا مگر کیا ان اداروں نے قوم کو ایسے صاحبانِ اخلاق و کردار مہیا کیے ہیں جو عملی زندگی میں قومی حمیت و کردار اور دیانتداری کا سمبل (SYMBOL) کہلا سکیں، جو جھکنے والے ہوں اور نہ ہی بکنے والے جن کے کردار کی لوگ گواہی دیں۔ یقیناً ایسا نہیں ہے کہ موجودہ تعلیم کا تعمیر اخلاق و سیرت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ملک میں اسلام کے حوالے سے اساتذہ کرام کو ایک پلیٹ فارم جماعت اسلامی نے فراہم کیا تھا تنظیم اساتذہ پاکستان کے ابتدائی دور کے ذمہ داران نے اساتذہ کی دینی و اخلاقی تربیت کے لیے ان کی تربیت گاہوں کا اہتمام کیا، انتہائی مخلص معلّمین تنظیم کی صفوں میں آئے مگر تنظیم نہ تو اپنی صفوں کے اندر مطلوبہ معیار کا تسلسل برقرار رکھ سکی اور نہ ہی اخلاق و کردار کی خوشبو باہر پھیلا سکی۔ نصف صدی میں کوئی نمایاں کارنامہ سامنے نہیں آیا۔ انفرادی مثالیں اپنی جگہ مگر یہ اجتماعیت کے لیے مؤثر ثابت نہ ہوسکیں۔ آج کسی بھی جگہ کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی جہاں اسلام کے نظریہ تعلیم پر استوار کامیاب ادارہ قائم ہو، نتائج دے رہا ہو۔ پراسپکٹس میں دعوے تو بلاشبہ بے شمار دیکھنے کو ملتے ہیں جبکہ دعوی کی پشت پر ثبوت غائب ہے۔

انقلاب بذریعہ تعلیم کے حوالے سے تیسرا اہم ستون جو انقلاب کی کامیابی کی ضمانت بنتا ہے وہ طلبا و طالبات کے والدین ہیں ماں کی گود ابتدائی درسگاہ ہے تو گھر کا مجموعی ماحول بھی ثانوی درسگاہ سے کم نہیں ہے۔ ان راستوں سے گزرتے بچہ بچی علم حاصل کرنے معلم و معلّمہ کے پاس جاتے ہیں اور وہاں درسگاہ میں بھی صرف چند گھنٹے ہی تو ان کا قیام ہوتا ہے بقیہ 16 یا 18 گھنٹے وہ گھر کی درسگاہ سے گھر کے بڑوں کے اخلاق و کردار، عمومی انفرادی رویوں سے، گھریلو رکھ رکھاؤ کے طور طریقوں سے سیکھتے ہیں علم کے ذرائع میں سے کتاب صرف ایک ذریعہ ہے جس کے لیے استاد اور مدرسہ مطلوب ہے۔ علم کے ذرائع میں دیکھنا اور سننا بھی ہے، خاموش مشاہدہ بسا اوقات کتابی علم کو مات بلکہ شہ مات دے جاتا ہے لہٰذا اولاد کے مشاہداتی علم میں اگر والدین مخلص اور باشعور ہوں، نظریہ حیات ان کے اپنے قلب و ذہن میں راسخ ہو تو اولاد کے لیے حقیقی علم تک رسائی اور اس کے مطابق عمل سمبل ہو جاتے ہیں جبکہ اس کے برعکس اگر گھر کا ماحول اور کتاب کا علم الگ الگ راہیں دکھائیں تو بچے الجھ جاتے ہیں منزل دور ہو جاتی ہے۔

نظریہ حیات جب تک والدین کے قلوب واذہان میں راسخ نہ ہوگا سکول کا بہترین نصاب اور صاحب کردار اساتذہ کی محنت رنگ نہ لائے گی صرف اس لیے کہ 16،18 گھنٹے پیارے والدین اور پیارے گھر میں بچہ بچی مختلف صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں۔ آج ہمارے گھروں میں جو کچھ دیکھنے میں آتا ہے وہ روشن خیالی کا غلبہ ہے۔ والدین کی بالعموم یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کا بیٹا بیٹی جب بولنا شروع کے تو وہ مام ڈیڈ کہے، اسے ناک آنکھ منہ کے بجائے نوزی آئیز اور ماؤتھ کہنا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔

والدین میں نظریۂ حیات پیدا کرنے کا واحد راستہ وہی ہے جو انسان کے خالق نے تجویز فرمایا، وہ ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب ﷺ کی اطاعت جو قران کریم اور کتب حدیث میں ہر وضاحت کے ساتھ درج ہے، جو سیرت رسول ﷺ اور سیرت صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، اسوۂ ائمہ کرام کی صورت میں محفوظ ہے اسی کے تابع اگر گھر اور مدرسہ، مدرسہ کا نصاب ہو تو انقلاب کا خواب شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے۔ بصورت دیگر یہ خواب تو رہ سکتا ہے تعبیر دیکھنا مقدر نہیں بن سکتا۔

چوتھا اہم ستون میڈیا اور معاشرہ ہے۔ میڈیا معاشرے کی تہذیب وتشکیل کا ذمہ دار ہے یا معاشرہ میڈیا کا قبلہ درست رکھنے کا ذمہ دار ہے۔ یہ مسئلہ حل طلب ہے۔ ماضی میں سماج و معاشرہ کی راہیں مسجد کی آواز متعین کرتی تھی اور پھر سماج ومعاشرہ میڈیا کا قبلہ درست رکھتا تھا۔ رفتہ رفتہ مسجد کی آواز اہمیت کھوگئی کہ علماء کہلوانے والا طبقہ باہمی انتشار وافتراق کا شکار ہوکر گروہ بندیوں کی نچلی سطح پر اتر آیا جس کے سبب اپنا وقار کھو بیٹھا اور اس کی جگہ مادر پدر آزاد میڈیا نے سنبھال لی۔

میڈیا آج مغرب زدہ ہی نہیں بلکہ مکمل طور پر مغرب کے ہاتھوں میں ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پورے زور شور سے مغربی طرز فکر کو نئی نسل کے قلب وذہن میں راسخ کرنے پر شب و روز مصروف ہے۔ ریڈیو، ٹی وی پروگرام تھے ہی ان پر مستزاد کیبل اور انٹرنیٹ کی محنت شاقہ ہے جو لحہ لحہ دل ودماغ سے اسلامی نظریہ حیات کو کھرچ لینے میں مصروف ہے جو لوگ اس کا قبلہ درست رکھنے کے مکلّف سمجھے جاتے ہیں وہی اس کی ترویج کے لیے کوشاں ہیں کہ وہ مغربی طرز تعلیم کے پروردہ ہیں۔

مذکورہ گزارشات کی روشنی میں انقلاب بذریعہ تعلیم سے مراد اگر تشکیل پاکستان سے ہم

آہنگ اسلامی نظریہ حیات کے لیے انقلاب ہے تو اس کے لیے بالکل نئے سرے سے بنیاد رکھنا ہوگی اسے ہر سطح پر الف، ب سے شروع کرنا ہوگا۔ ہر ستون کو اسی رنگ میں رنگنا ہوگا اور رنگ بھی وہ جو (ANTI RUST) ہر زنگ سے ستون کو محفوظ رکھنے والا ہو۔ نصاب نئے سرے سے ترتیب دینا ہوگا انتہائی محنت سے چھانٹ کر عملاً نظریہ پاکستان پر ایمان رکھنے والے اساتذا کرام کی ٹیمیں تشکیل دے کر ان کے ذریعے اساتذہ کرام تیار کرنے ہوں گے جو قول و فعل اور اخلاق و کردار سے طلبا و طالبات کے لیے روشنی کے مینار ہوں۔

تعلیمی اخراجات کو کم سے کم کرنا، ذریعہ تعلیم مادری زبان پر کاربند رہنا، بڑی جماعتوں میں انگریزی یا دوسری زبانیں سکھانا، درسگاہ کا ماحول خالصتاً تعلیمی ہی رکھنا اور پھر ہر چیز پر مقدم معمار قوم کو معاشی مار سے بچانا، ہمارا مطلوب ہے معقول تنخواہ دینا انتہائی ضروری ہے۔ آج ہر شعبہ میں تنخواہیں دگنی ہیں مگر دو گنا تین گنا یا لاکھوں میں تنخواہوں اور مراعات لینے والوں کو اس مقام پر لے جانے والوں کو سب سے گھٹیا مجبور مخلوق سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ یہی طبقہ فی الواقع ہر احترام اور ہر اعزاز کا حق دار ہے ہمارے نقطہ نظر سے تعلیمی انقلاب کے ذریعے ملکی اور پھر بین الاقوامی انقلاب کی منزل اسی راستے پر چلتے مل سکتی ہے مگر راستہ ہے مشکل۔

؎ اسی راستے پہ چل کر آسکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

نظریاتی تعلیم

ڈاکٹر محمد رفیع الدین (مرحوم)

ماہرین تعلیم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تعلیم انسانی شخصیت کے فروغ وارتقاء کا ذریعہ ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ اس ارتقاء کی صورت کیا ہوتی ہے اور انسان کی مکمل شخصیت سے کیا مراد ہے؟ آیئے ان سوالوں کے جواب معلوم کرنیکی کوشش کریں۔

یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ تعلیم سے ہر فرد کی شخصیت ایک ہی صورت میں ترقی پذیر نہیں ہوتی۔جس طرح دنیا میں جانداروں کی اتنی ہی جسمانی شکلیں ہیں جتنی ان کی قسمیں، بعینہٖ انسانی شخصیت کی اسی قدر صورتیں ہیں جس قدر دنیا میں معاشرے اور اقوام موجود ہیں۔ بڑے بوڑھے اپنے بچوں کو پہلے گھر پر پڑھاتے ہیں' بعدازاں قومی سکولوں اور کالجوں میں بھیجتے ہیں۔اس طرح بچوں میں شخصیت کا ایک مشترک نمونہ جنم لیتا ہے۔ یہ سلسلہ نسل درنسل چلتا ہے جس طرح جانداروں کی ایک قسم نامیاتی اجسام کی نئی نسلیں پیدا کر کے اپنا وجود قائم رکھتی ہے اسی طرح ایک قوم افراد کی نسلوں کے ذریعے زندہ رہتی ہے۔ یہ نسلیں انسانی شخصیت کی مشترک نفسیاتی صورت کو دہراتی رہتی ہیں۔

قوم ایسے ہم خیال افراد کے مجموعہ کا نام ہے جو زندگی کا مشترک نصب العین یا نظریہ رکھتے ہوں۔ یہ نظریہ انہیں بتاتا ہے کہ کس بات پر یقین کیا جائے اور کس پر نہیں، کونسا کام کیا جائے اور کون سا نہیں۔قوم کے تمام افراد سچ اور جھوٹ، جائز، ناجائز، اچھے برے، خوبصورتی اور بدصورتی کو ایک ہی پیمانے سے ناپتے ہیں۔یعنی ان صداقتوں کے متعلق مشترک نظریہ اور نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ کیونکہ کسی قوم کا نظریہ حیات ہی ایسی قوت ہوتی ہے جس کی محبت انہیں متحد کرتی ہے انہیں قومی وجود بخشتی ہے۔اور بحیثیت قوم زندہ رکھتی ہے۔مقصد حیات قوم کی اہم ترین متاع ہے

ایک قوم جتنی زیادہ اپنے نظریہ پر جان چھڑکتی ہے اُسی قدر وہ مضبوط متحد ہوتی ہے۔

قومی نصب العین کو سمجھنے اور اسے عملی زندگی میں اپنانے کے لئے قوم کے ہر فرد کو حقائق کے متعلق ایک خاص نوعیت کا علم حاصل کرنا پڑتا ہے۔ جس سے اس کے ذہن، عادات واطوار، خواہشات، مرغوبات ومیلانات، معیارات واقدار، عزائم وتوقعات، محرکات وجذبات، عقائد و خیالات اور اغراض ومقاصد میں قومی نظریہ سے مطابقت وہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ قومی نصب العین وہ مرکز ہے جس کے گرد قوم کے فرد کا نفسیاتی نظام پروان چڑھتا ہے اور تعلیم وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے معاشرے کی ہر نسل اپنی آئندہ نسل کے لئے یہ نفسیاتی سامان چھوڑ جاتی ہے۔

لہٰذا یہ سوال کہ آیا خاص عقائد ونظریات کو براہ راست یا بالواسطہ ذہن پر نقش کرنا اچھا ہے یا برا، خارج از بحث ہے۔ چونکہ نظام تعلیم انسان میں وہ مخصوص علم وعرفان، عقائد، خیالات اور عادات واطوار پیدا کرتا ہے جو ایک خاص نظریہ یا نصب العین سے ہم آہنگ ہوں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم کی غرض وغایت نظریات کو ذہن نشین کرنے کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس سادہ سی حقیقت سے کون آگاہ نہیں کہ جب کسی خاص نظریاتی برادری یا قوم میں بچہ جنم لیتا ہے تو قوم اس کی تعلیم وتربیت کے ایسے خطوط متعین کر دیتی ہے جن پر چل کر وہ کسی طرح بھی اپنے آباؤ اجداد کے عقائد وخیالات اور عادات واطوار سے انحراف نہ کرنے پائے۔

ایک طالب علم کو نام نہاد درسی آزادی صرف ان تعلیمی اداروں میں میسر آسکتی ہے جو کسی نظریاتی قوم کے زیر اہتمام چل رہے ہوں۔ ان اداروں میں ایک استاد دعویٰ تو کر سکتا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کے سامنے ہر مسئلہ کے تمام پہلو غیر جانبداری سے پیش کرتا ہے اور انہیں آزادانہ انداز میں سوچنے اور نتائج اخذ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن اس کی انسانی جبلت اسے ایسا کرنے نہیں دیتی۔ کیونکہ جب وہ اپنے طلبہ کے سامنے کسی مسئلہ کے مختلف پہلو رکھتا ہے تو شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کی کوشش ہوتی ہے کہ ایک خاص نکتہ نظر' کو جو اس کا قومی نظریہ ہوتا ہے' دیگر تمام نظریات سے بڑھا چڑھا کر بیان کرے اور طلبہ میں اسے مقبول بنائے۔ ایک نظریاتی قوم کے فرد کی حیثیت سے اسے قومی نظریہ سے محبت کرنے اور اسے پھیلانے کی تعلیم دی گئی ہوتی ہے۔ یہ تعلیم اس کے دل ودماغ پر اس طرح حاوی ہوتی ہے کہ وہ نظریہ سے انحراف کر کے قوم کے غیظ و

غضب، نفرت وحقارت اور ملازمت سے برطرفی کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ چنانچہ وہ اُستاد مجبور ہے کہ ہر مسئلہ پر بحث کرتے وقت اپنے قومی نقطہ نظر کو دوسرے تمام نظریات پر ترجیح دے۔

استاد کا مثالی نصب العین اس کی اپنی ذات کا ایک حصہ ہوتا ہے اس وقت بھی جب کہ وہ معلم کا کردار ادا کر رہا ہو۔ شاگردوں کے سامنے کسی مسئلہ کے سارے گوشے پیش کرتے وقت وہ مجبور ہے کہ ان پر اپنے نظریہ کا رنگ چڑھائے۔ وہ جس غیر جانبداری کا دعویٰ کرتا ہے۔ دراصل وہ اس کے نصب العین کے مطابق مخصوص غیر جانبداری ہوتی ہے۔ اپنے شاگردوں کو وہ آزادی سے سوچنے کی اجازت اسی صورت میں دیتا ہے کہ ان کی سوچ قومی نظریہ کے مطابق ہو اور غور وفکر کے بعد وہ جن نتائج تک پہنچیں وہ قومی نقطہ نظر کے خلاف نہ ہوں۔ بصورتِ دیگر ان کے اخذ کردہ نتائج اُستاد کی نظر میں آزادانہ سوچ کا نتیجہ نہیں ہوں گے۔ کیونکہ وہ اس بات کا قائل ہے کہ ایک طالب علم کو آزادی، غیر جانبداری اور درسی آزادی کی فضا میں سوچتے وقت وہی نتائج اخذ کرنے چاہئیں اور انہی خیالات کو دل میں جگہ دینی چاہئے۔ جو اس کے اپنے نظریہ کے مطابق ہوں۔ یہ استاد کبھی اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ اس کے اپنے خیالات یک طرفہ اور متعصّبانہ ہیں حالانکہ اس کے خیالات کسی آزادانہ سوچ اور مختلف نظریات میں سے اچھے انتخاب کا نتیجہ نہیں ہوتے، ظاہر ہے جو استاد خود اپنی ذات کے ساتھ غیر جانبداری نہیں برت سکتا۔ وہ نظریات کے بارے میں کیسے غیر جانبدار ہو سکتا ہے۔

اگر کوئی استاد واقعی اس قابل ہے کہ اپنے شاگردوں کے سامنے غیر جانبداری سے کسی متنازعہ مسئلہ کے جملہ پہلو رکھ سکے تو سمجھ لو وہ اس نتیجہ پر خود نہیں پہنچا بلکہ کسی ذہنی بیماری کا شکار ہے۔ ایک خیال کو دوسرے سے بہتر سمجھنا یا ایک رائے کو دوسری پر ترجیح دینا ایک فطری اور ناگزیر عمل ہے بحیثیت انسان وہ اپنے اندازِ فکر میں غیر جانبدار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس سے قطع نظر کہ وہ کیا کہتا ہے اور کیا پڑھاتا ہے، یہ ماننا پڑے گا کہ انسان ہونے کی حیثیت میں اس کے شاگرد بھی سوچ کے معاملے میں غیر جانبدار نہیں ہو سکتے' وہ ہر متنازعہ فیہ مسئلہ کے بارے میں آسانی سے اپنے استاد کی مخصوص رائے کو سمجھ لیتے ہیں اور اپنے نقطہ نظر کو اسی کے مطابق ڈھال لیتے ہیں گویا کسی یونیورسٹی میں پڑھنا اور پڑھانا ایک مخصوص نظریہ کی فکری فضا کے مطابق ہوتا ہے جو ذہن کو اس نظریہ کی

حمایت میں تیار کرتا ہے جو معلم اس نظریہ کی اچھائی اور برائی سے ناواقف ہو وہ اپنے کام کا اہل نہیں ہوسکتا۔

تعلیمی آزادی کے بارے میں ہر نظریاتی قوم کا ایک نکتہ نظر ہوتا ہے کہ اس آزادی کے ذریعے کن عقائد و خیالات کی طرف طلبہ کی رہنمائی کی جائے۔ کیمونسٹ معاشرہ کا خیال ہے کہ اگر طلبہ کو حقیقی آزادی میسر ہو اور وہ سرمایہ داری کے مبلغ استادوں کے زیر اثر نہ ہوں تو یقیناً سرمایہ دارانہ فلسفہ حیات کو غلط جان کر ٹھکرا دیں گے۔ اس کے برعکس جمہوریت پسند معاشرہ کی رائے ہے کہ اگر طلبہ کو آزادی سے سوچنے کا موقع دیا جائے تو وہ لازماً کیمونزم کی مذمت کریں گے اور اس سے منہ موڑ لیں گے۔ ایسی صورت میں درسی آزادی کیا معنے رکھتی ہے۔

کسی قوم کے بڑے بوڑھے اپنی نوخیز نسل کو صرف ان خیالات و آرا کے متعلق آزادی سے سوچنے کا اختیار دے سکتے ہیں جنہیں وہ سمجھتے ہوں کہ زندگی میں ان کی زیادہ وقعت نہیں۔ جمہوریت پسندی کا دعویٰ کرنے والے بھی اس اُصول سے مستثنیٰ نہیں۔ کیا اس حقیقت سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ جمہوری اقوام کے تعلیمی اداروں میں جمہوریت اور آزادی کے اسباق ذہن نشین کرائے جاتے ہیں۔ لیکن اساتذہ اور طلبہ کو کمیونسٹ بننے کی آزادی نہیں ہوتی۔ پس ایک نظریاتی قوم کے بوڑھے اپنی نئی نسل کو یہ ڈھیل نہیں دے سکتے کہ وہ موجودہ قومی نظریہ سے مطمئن نہ ہوں۔ تو اس سے بہتر نظریہ منتخب کرنے کے بارے میں سوچ بھی سکیں۔ جب آزادی کا تصور بھی اتنا آزاد نہیں کہ اپنا محاسبہ کر سکے اور یہ دیکھ سکے کہ کہیں اس کا دعویٰ بے معنی تو نہیں، پھر اور کسی نصب العین کی کیا وقعت ہوسکتی ہے۔

تمام نظریاتی اقوام، خواہ وہ جمہوریت پسند ہوں یا آمریت پسند، تعلیمی اداروں میں اپنی ثقافت کی تعلیم کا خاص اہتمام کرتی ہیں۔ مخالفانہ خیالات براہ راست یا بالواسطہ تنقید کے ذریعے جھٹلائے جاتے ہیں تا کہ بچوں کے ذہن پر اثر انداز نہ ہوں۔ چنانچہ ہر قوم کے نزدیک تعلیم کا آخری اور اہم ترین مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنی نئی پود کے ذہنوں میں قومی نظریہ پر یقین کو مستحکم کیا جائے۔ تعلیم ابتدا سے انتہا تک نظریاتی ہوتی ہے۔ اس لئے تعلیم یافتہ افراد کے لئے اپنے قومی نصب العین سے انحراف اسی طرح ناممکن ہوتا ہے جیسے کسی نسل کے باغ اپنی نوع کی مشترک جسمانی ساخت سے انحراف نہیں کر سکتے۔

حصہ ششم

نظریاتی ریاست

اور

نظریاتی نظام تعلیم

☆ نظریہ اور ایمان
☆ نظریاتی ریاست میں نظریاتی افراد کی تیاری کا کام
☆ نظریاتی نظام تعلیم و تربیت
☆ نظریاتی نظام تعلیم .....نظریاتی ریاست کا اہم ستون
☆ مغرب کے سیکولر نظام کا کھوکھلا پن
☆ نظریاتی ریاست میں نظریاتی نظام تعلیم کیوں ناگزیر ہے
☆ پاکستان.....ایک اسلامی نظریاتی ریاست
☆ پاکستان کی نظریاتی ریاست کے لئے ناگزیر اسلامی نظام تعلیم
☆ پاکستان میں نظریاتی نظام تعلیم
☆ خوشحال اور ترقی یافتہ پاکستان
☆ نظریاتی نظام تعلیم اور ہمارے دینی مدارس

نظریاتی ریاست اور نظریاتی نظام تعلیم

نظریہ اور ایمان

ایک فرد کی حیثیت سے مسلمان کے لئے جو اہمیت 'ایمان' کی ہے وہی اہمیت اجتماعی اور ریاستی سطح پر نظریہ کی ہے۔ ایمان کے بغیر فرد کا کوئی عمل نتیجہ خیز نہیں ہے ایک دکھاوا ہے اسی طرح نظریہ کے بغیر ریاست کا کوئی قدم حقیقی سمت میں نہیں اُٹھ سکتا۔ ایمان کے کچھ ناگزیر ظواہر ہیں۔ اسی طرح نظریاتی ریاست کے لئے بھی کچھ ظاہری اقدامات کرنا ضروری ہیں چنانچہ میڈیا پالیسی، صنعتی پالیسی، لیبر پالیسی، خارجہ پالیسی، داخلہ پالیسی، سفارت کاری کے اُصول، تجارتی پالیسی وغیرہ ہر میدان میں بنیادی طور پر چند اُصول اور کام کا طریق کار طے کرنا ضروری ہے تاکہ کہیں کوئی رخنہ باقی نہ رہے اور دشمنوں کی کاروائی کے امکانات ختم نہیں تو کافی حد تک کم ضرور ہو جائیں۔

ایمان کی حفاظت فرد پر واضح ہوگی تو نظریہ کی حیثیت و اہمیت ریاستی سطح پر نگاہوں کے سامنے رہے گی گویا نظریاتی ریاست میں ایسے افراد کی بہت ضرورت ہے جو اپنے نظریہ سے سو فیصد (FULLY COMMITTED) ہوں اور اسی کے تحت عملی زندگی گزار رہے ہوں۔

فرد کی زندگی میں ایمان کا معاملہ بڑا نازک ہے اس لئے کہ ایمان حقیقی ایک 'یقین قلبی' کا نام ہے جو ایک باطنی اور قلبی معاملہ ہے۔ یہ ایمان حقیقی گھٹتا بھی ہے (جب فرد کے طرزِ عمل معاملات میں اس کی نگہبانی کا جذبہ کمزور پڑ جائے تو ایمان گھٹ جاتا ہے) اور بڑھتا بھی ہے۔ ریاست کی سطح پر نظریہ کا معاملہ بھی یہی ہے۔ لہٰذا نظریہ کو زندہ اور بیدار رکھنے کے لئے افراد کو نظریہ کی اہمیت اور اس کی حفاظت کا عادی بنانا ضروری ہے یا نظریہ کی حفاظت کے لئے ریاست کے افراد میں اس نظریہ پر 'ایمان' کا ایک اعلیٰ مقام قائم رکھنا ضروری ہے؛ تاکہ اس کے اثرات سے معاشرے کے کمزور طبقات بھی اپنے لئے روشنی حاصل کرتے رہیں اور نظریہ کو 'عملی گواہی' یا 'شہادتِ حق' کا یہ سلسلہ افراد کی زندگی میں قائم رہے اور اس کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے۔

نظریاتی ریاست میں نظریاتی افراد کی تیاری کا کام

ایک نظریاتی ریاست کے استحکام اور اس کی پائیداری کے لئے اس ریاست کے سارے وسائل اپنے شہریوں کے لئے وقف ہونے لازمی ہیں اور فلاحی سرگرمیوں (ہسپتال، سڑکیں، سکول، پارک، صفائی ستھرائی، ماحول کی پاکیزگی، سفر کی سہولتوں وغیرہ) سے کہیں زیادہ اپنے شہریوں کی نظریاتی تعلیم وتربیت پر صرف کرنے کی ضرورت ہے اور یہی ریاست کے مقتدر حضرات کی طرف سے ریاست کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ نظریاتی تعلیم وتربیت کی اہمیت آج سے ہزاروں سال پہلے بھی 'بنیاد کا پتھر' کے طور پر ضروری تھی اور آج بھی اُسی طرح ناگزیر ہے۔

ایک نظریاتی ریاست کے 'نظامِ تعلیم وتربیت' کا نظریاتی ہونا ازحد ضروری ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ اگر ایک نظریاتی ریاست اپنے نظامِ تعلیم وتربیت پر اتنی توجہ نہ کرے اور اسے 'ترجیحِ اوّل' (TOP PRIORITY) نہ سمجھے تو کچھ عرصے میں وہ نظریہ کمزور پڑ جائے گا اور ریاست تحلیل ہو جائے گی۔ لہٰذا ایک نظریاتی ریاست میں نظامِ تعلیم بھی نظریاتی ہونا لازمی ہے اور نظامِ تربیت بھی۔

نظریاتی نظامِ تعلیم وتربیت

ریاست کی سطح نظامِ تعلیم کو نظریہ کے تابع بنانا بہت بنیادی کام ہے اور اس نظام کے تمام گوشوں میں وہ نظریہ ایسا رچا بسا ہو کہ اس نظامِ تعلیم کے تحت تعلیم پانے والا ہر بچہ اس نظریے پر گہرا 'ایمان' اور 'یقین' کا سرمایہ لے کر تعلیمی ادارے سے فارغ ہو۔ ایسے نظامِ تعلیم سے نظریاتی طور پر پختہ ہو کر آنے والے افراد اور نسلیں ہی ریاست کے نظریہ کی حفاظت کر سکتی ہیں اور اُسے ایک کامیاب ریاست بنا سکتی ہیں۔

آج کے دور میں ریاست کے سرکاری، نیم سرکاری، اور غیر سرکاری دفتری کارکن اور اہل کار سب اسی نظام سے آتے ہیں لہٰذا ریاست کا نظامِ تعلیم نظریاتی ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ تمام سرکاری اہل کار بھی نظریاتی افراد نہ ہوں اور مستثنیٰ افراد اور مثالوں کو چھوڑ کر ساری سرکاری مشینری نظریاتی اُصولوں اور تقاضوں کے مطابق فیصلے کرنے اور اس کو اسی سوچ کے تحت عملدرآمد کرانے والی بن جائے تو ریاست کا استحکام اور کامیابی اس کا لازمی نتیجہ ہوگا اور کامیاب نظریاتی ریاست

سے اس کے عوام بھی اس نظریہ کے مطابق خوش وخرم اور خوشحال ہوں گے۔ ایک نظریاتی ریاست کی خوشحالی وکامیابی' قریب کے دیگر ممالک میں بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ ہوااور سورج کی شعاعوں کی طرح نظریات کی بھی جغرافیائی سرحدیں نہیں ہوتیں اور ایک کامیاب نظریہ' تازہ ہوا کے جھونکے' کی طرح جغرافیائی سرحدوں کے پار افراد کو بھی ذہنی وقلبی سرور دے جاتا ہے۔

نظام تعلیم کی طرح ہر نظریاتی ریاست کا ایک تربیتی نظام بھی لازمی اور ناگزیر ہے۔ آج سے ہزار دو ہزار سال قبل کی نظریاتی ریاست کا نظام تربیت اور طرح سے مدوّن ومرتب ہوتا تھا آج کے دور......عصر حاضر میں کئی حکومتی شعبہ جات اس نظام تربیت کا حصہ بن کر اپنا فرض ادا کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ریاست کے تمام شہری خوشگوار موسم کے اثرات کی طرح اس نظام تربیت کی برکات سے متمتع نہ ہوسکیں بلکہ اس نظام تربیت سے کوئی فرار کی راہ باقی ہی نہیں رہنے دینی چاہیے۔

عصر حاضر میں ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے عوامی تربیت اور ذہن سازی کا بہت سا کام ہو رہا ہے افسوس کہ آج یہ ادارے زیادہ کام منفی بنیادوں پر کر رہے ہیں اور بے راہ روی سکھا رہے ہیں اگر یہی ادارے مثبت طور پر قوم کی تعمیر، نظریات کی آبیاری اور ریاست کے افراد میں نظم وضبط پیدا کرنے کے لیے ایسے پروگرام شروع کردیں تو یہی ادارے نظریاتی ریاست کا اثاثہ (ASSETTS) شمار ہوں گے۔ اسی طرح ریڈیو اور ٹی وی کے علاوہ کیبل، انٹرنیٹ، تجارتی اشتہار، شاہرات پر نصب بڑے بڑے اشتہاری بورڈ، ڈرامے، تھیٹر، ادب، شاعری، ناول افسانے، مضامین، تحریریں، اخبارات، جرائد غرض دوسروں کو متاثر کرنے والے تمام ذرائع اور رائے عامہ میں تبدیلی کا ذریعہ بننے والے تمام افراد اس نظریاتی تربیت کے نظام کا حصہ بن سکتے ہیں اور مثبت کردار ادا کرسکتے ہیں۔

یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے اور بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ نظریاتی ریاست کے لئے نظریاتی نظام تعلیم اور نظریاتی نظام تربیت از حد ضروری ہے۔

نظریاتی نظام تعلیم......نظریاتی ریاست کا اہم ستون

نظریاتی ریاست کی عمارت جن ستونوں (PILLARS) پر کھڑی ہوتی ہے ان میں مقنّنہ، انتظامیہ اور عدلیہ تو اہم ستون ہیں ہی اس کے لئے فوج اور صحافت

(JOURNALISM) کو چوتھے اور پانچویں ستون کی حیثیت حاصل ہے۔نظریاتی ریاست کے لئے فوج کی اہمیت یہ ہے کہ وہ ریاست کی جغرافیائی حدود کی حفاظت کرتی ہے اور ریاست کو اندرونی اور بیرونی خطرات سے بچاتی ہے۔

اسی طرح صحافت اور صحافی حضرات یا آج کل الیکٹرانک میڈیا کو پرنٹ میڈیا کے ساتھ جمع کرلیں تو میڈیا ریاست کا اہم ستون ہے اور نظریاتی میڈیا یا متوازن اور دیانت دار میڈیا نظریاتی ریاست میں مقنّنہ، انتظامیہ، عدلیہ اور فوج کا محاسبہ کرتا ہے اور ان کی نگرانی کرتا ہے اور اپنے وسائل سے ریاستی اُمور کے وہ اُمور عوام کے سامنے پیش کرتا ہے جو عام طور پر سامنے نہیں آتے یا انتظامیہ سامنے لانا نہیں چاہتی۔فرض شناس اور دیانت دار میڈیا سے عوام کو اپنی حکومت کے اندرونی یا داخلی معاملات کا بھی علم ہوتا رہتا ہے اور انتظامیہ اس دباؤ میں ریاستی اُمور میں معاہدات یا معاملات میں ہوشیار (VIGILIANT) رہتی ہے اور اس طرح ریاست کے اُمور درست سمت میں رواں دواں رہتے ہیں۔

اسی طرح نظریاتی ریاست میں ایک نظریاتی نظام تعلیم کی ازحد ضرورت ہے اور ہمارے نزدیک کسی نظریاتی ریاست کے استحکام اور بیداری کے لئے لازم وملزوم کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ دور مغرب کی بالادستی کا دور ہے وہ اپنے ریاست کے اُمور بظاہر سیکولر انداز میں چلا رہے ہیں اور اپنا نظام تعلیم بھی سیکولر اُصولوں پر استوار کرلیا ہے۔وہ ترقی پذیر ممالک یا تیسری دنیا کے ممالک پر نظریاتی سطح پر حملہ آور ہوکر دراصل ان ممالک کے نظام کو دوستی کے انداز میں سیکولر کردینا چاہتے ہیں اور کوئی فوجی حملہ کیے بغیر باقی دنیا کو فتح کرلینا چاہتے ہیں اور سیکولر ریاستوں میں تبدیل کردینا چاہتے ہیں۔

مغرب کے ترقی یافتہ ممالک کی یہ اخلاقی سطح پر (اگر ان کے ہاں اپنے سفارتی اور تجارتی معاملات کے بزنس رولز (BUSINESS RULES) میں 'اخلاق' اور ETHICS نام کی کوئی شے باقی رہ گئی ہے) ایک بددیانتی ہے کہ وہ اُصولی سطح پر تعلیمی اداروں میں دنیا کے نظام تعلیم کو ریاست کا اہم ستون قرار نہیں دے رہے تاکہ دنیا کی نظریاتی ریاستوں کو اپنے نظریہ کے مطابق ایک نظریاتی نظام وضع کرنے کے موقع کا احساس نہ ہوجائے۔

مغرب کے سیکولر نظام کا کھوکھلا پن

عصر حاضر کے مغربی ممالک یعنی مغرب کی سیکولر ریاستوں میں اپنے لئے نظام تعلیم کو اہمیت دی ہے اور اپنے لئے ایک سیکولر اور لادین بنیادوں پر نظام تعلیم تجویز کر کے نافذ کر دیا ہے۔ مگر علمی اور تعلیمی سطح پر اس نظریاتی نظام تعلیم کو ریاست کا ستون ہونے کا اعلان نہیں کرتے یا اسے شامل نصاب نہیں کرتے نہ اس کو اہمیت دے کر پڑھاتے ہیں۔

یہ اخلاقی بد یانتی.....مغرب کے موجودہ سیکولر نظام اور اس کے تحت سیکولر نظام تعلیم کے بے دلیل ہونے اور کھوکھلے پن کا واضح اور انمنٹ ثبوت ہے۔ بصورت دیگر مغرب کی یونیورسٹیوں اور درسگاہوں میں نصابی اور CARRICULUM کی سطح پر ریاست کے اہم ستونوں میں نظام تعلیم کا تذکرہ ضروری تھا۔ وہ اپنے ہاں نظام تعلیم کو ریاست کا اہم ستون قرار دینے اور ریاست سازی کے معاملات میں چھٹا ستون قرار دینے کی تعلیم نہ دے کر ترقی پذیر ممالک اور غیر ترقی یافتہ ممالک سے اپنے نظریات کے مطابق اپنا ایک نظریاتی نظام تعلیم و تربیت تشکیل دینے کا حق غصب کر رہے ہیں یعنی دھوکہ اور چالاکی سے ان تمام ریاستوں کو غیر شعوری طور پر سیکولر بنانے کے راستے پر گامزن ہیں تاکہ یہ ممالک آہستہ آہستہ سیکولر بن جائیں اور ان کے پیچھے پیچھے چلنے پر مجبور ہو جائیں۔

نظریاتی ریاست میں نظریاتی نظام تعلیم کیوں ناگزیر ہے

ہمارے نزدیک ایک نظریاتی ریاست کے تشکیل پا جانے کے بعد اس ریاست میں نظریاتی تسلسل کے لئے ایسے ہاتھوں کی ضرورت ہے جو اسی نظریہ کی بنیاد پر استوار ایک نظام تعلیم سے نکل کر آئے ہوں۔ یہ ریاست کے استحکام کے لئے ہی نہیں اس کی بقا اور دوام کے لئے بھی لازمی ہے۔ خدانخواستہ کسی نظریاتی ریاست کے تشکیل پا جانے کے بعد اگر اس ریاست کی سرکاری مشینری میں اور مقنّنہ، انتظامیہ اور عدلیہ میں اسی نظریہ کے مطابق تربیت یافتہ حضرات میسر نہ آسکیں تو اس نظریاتی ریاست کا نظریاتی طور پر DE-RAIL ہو جانا اٹل حقیقت ہے اور یوں وہ ریاست اپنی بنیادوں سے ہٹ کر بکھر جائے گی۔

گویا کسی نظریاتی ریاست سے انتہا درجے کی دشمنی یہ ہوگی کہ اس نظریاتی ریاست کے نظام پر کسی طرح مؤثر ہوکر اس کے نظام تعلیم کو بدل دیا جائے، نظریاتی بنیادوں سے ہٹا دیا جائے یا آج کی اصطلاح میں سیکولر کر دیا جائے تو کسی بیرونی فوج کے حملہ کیے بغیر وہ ریاست ایک نسل بعد دم توڑ دے گی۔

پس یہ بات ایک اُصول موضوعہ اور اٹل حقیقت کے طور پر سامنے رہنی چاہئے کہ ایک نظریاتی ریاست کے لئے اسی نظریے کے مطابق ایک نظریاتی نظام تعلیم اس ریاست کی بقا اور سرکاری مشینری کو تازہ دم نئے نظریاتی افراد مہیا کرنے کا نظام ہے اور اس نظام کی سخت حفاظت اور نگرانی ضروری ہے وگرنہ دشمن کے ایجنٹ اس سیکٹر سے حملہ آور ہوکر اس نظریاتی ریاست کو اسی کی اگلی نسل کے ہاتھوں توڑ پھوڑ کر رکھ دیں گے۔

پاکستان.....ایک اسلامی نظریاتی ریاست

دوقومی نظریہ.....جس کے تحت پاکستان بنا اور معرض وجود میں آیا تھا اسی دوقومی نظریہ کے تحت مسلمانوں کے داخلی معاملات کا مرکز بقول علامہ اقبال

ع اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے

اسلام ہے اور یہی نظریۂ پاکستان ہے اور اسی وجہ سے پاکستان ایک اسلامی نظریاتی ریاست ہے۔

اُصولی طور پر.....ایک ریاست کی ذمہ داری ہی یہ ہے کہ.....ریاست کے اندر بسنے والے انسانوں کی اکثریت کو ان کی اجتماعی خواہشوں، امنگوں اور آرزوؤں کے بروئے کار لانے کے لئے اپنے تمام وسائل وقف کر دے۔

پاکستان مسلمانوں کی اکثریت کا ملک 14/اگست 1947ء کو ہندوؤں سے لڑ کر ایک علیحدہ مسلمان ''قوم'' کے تشخص کی بحالی اور حفاظت کے لئے وجود میں آیا تھا۔ پھر مسلمان یہاں 97% اکثریت میں ہیں۔

اسی کے لئے پاکستان کا مطلب کیا؟ ''لا الہ الا اللہ'' کا نعرہ لگایا گیا تھا۔ مسلمانوں کے شاندار ماضی میں (چاہے مغلیہ دور حکومت ہو یا اندلس میں 800 سالہ بنواُمیہ کا دور ہو یا بنوعباس کی خلافت بغداد کا دور) اقلیتوں سے حسن سلوک چونکہ سنہری حروف میں کندہ ہے اور اپنے

پرائے سب اس کو تسلیم کرتے ہیں اسی وجہ سے 3% غیر مسلم اقلیتوں نے پاکستان میں اقلیتی حیثیت کو قبول کیا تھا اور آج بھی دنیا بھر میں سب سے زیادہ اقلیتی حقوق پاکستان میں میسر ہیں۔

لہٰذا پاکستان ایک اسلامی نظریاتی ریاست ہے اسی بنا پر ابتدائی سالوں میں اسے مملکت خداداد پاکستان کہا جاتا تھا۔ خداداد کے معنی ہیں خدا کی عطا کردہ اور مسلمانانِ ہند کی اجتماعی سوچ پر پاکستان کے پہلے آئین کی منظوری کے بعد پاکستان کا نام ''اسلامیہ جمہوریہ پاکستان'' قرار پایا تھا۔

پاکستان کی نظریاتی ریاست کے لئے ناگزیر
اسلامی نظام تعلیم

پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے اور اس کا نظریہ اسلام ہے تو ریاست کی بنیادی تعریف کے مطابق پاکستان کے ہر مسلمان شہری کے لئے ایسا نظریاتی نظام تعلیم وضع کرنا ضروری ہے جو

☆ اس میں بسنے والے مسلمان (خواتین و حضرات) کو اپنے جملہ دینی فرائض (واجبات) سے آگاہی اور اس کی ادائیگی میں مدد و معاون ہو۔

☆ ایسے کردار کی تعمیر کرے جو اس ریاست کی تعمیر و ترقی میں مدد ہو۔

☆ ایسے افراد تیار کرے جو آگے چل کر عملی زندگی میں ریاست کو نظریاتی رُخ پر چلانے کے اہل ہوں۔

☆ عوامی سطح پر ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت جو ریاست کے اچھے اور باکردار مسلمان شہری قرار پاسکیں۔

پاکستان میں نظریاتی نظام تعلیم

پاکستان میں تعلیمی اصلاحات کر کے اگر ایک نظریاتی نظام تعلیم نافذ کر دیا جائے تو اُس کے بڑے خوشگوار اثرات مرتب ہوں گے۔ ہمارے تعلیمی اداروں (سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور فنی تعلیمی اداروں وغیرہ) سے جو لاکھوں طالب علم ہر سال فارغ ہوتے ہیں انہیں میں سے

☆ ایک معتد بہ حصہ فوج میں چلا جاتا ہے، بری فوج، بحریہ، فضائیہ کا حصہ بنتے ہیں۔

☆ اعلیٰ تعلیمافتہ سرکاری ملازمتوں میں جاتے ہیں۔ڈاکٹر، انجینئرز، اوسیرز وغیرہ

☆ ایک مخصوص تعداد شعبہ وکالت سے وابستہ ہو جاتے ہیں جن میں سے بعد میں مختلف امتحانات سے گزر کر ججز وغیرہ بنتے ہیں اور اعلیٰ عدلیہ تک پہنچتے ہیں۔

☆ حکومتی DMG کیڈر، وفاقی سروسز اور صوبائی کیڈر میں بھی ہر سال بہت سے لوگ جاتے ہیں اور حکومتی مشینری کا حصہ بنتے ہیں بہت سے لوگ پولیس میں بھرتی ہو جاتے ہیں۔

☆ سیاسی میدان میں ایم این اے، ایم پی اے، ضلع ناظم، تحصیل ناظم اور ناظمین بنتے ہیں۔

☆ ایک طبقہ حکومتی دفاتر میں اہل کار تعینات ہوتے ہیں۔

☆ سرکاری غیر سرکاری صنعتوں، کارپوریشنوں یعنی PIA، PSC، PS، PR وغیرہ میں جاب حاصل کرتے ہیں۔

☆ ایک بڑا طبقہ سرکاری غیر سرکاری تعلیمی اداروں سے وابستہ ہو جاتا ہے یعنی پروفیسرز، لیکچرر اساتذہ وغیرہ تعینات ہوتے ہیں۔

☆ اسی طرح ڈاکٹر وانجینئر، عدالتوں ہسپتالوں کے ساتھ وابستہ عملہ فنی اداروں سے تربیت حاصل کر کے اس شعبہ سے وابستہ ہوتا ہے۔

☆ کئی نوجوان تعلیم سے فارغ ہو کر ذاتی کاروبار میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ذاتی کاروبار اور انڈسٹری میں ایک بڑی تعداد خواتین وحضرات کی مصروف عمل ہوتی ہے۔

یہ تمام افراد (خواتین وحضرات) اگر ملکی نظام تعلیم سے نظریاتی تعلیم حاصل کر کے میدان عمل میں اتریں گے تو اس کے اثرات ہمارے پورے نظام اور ملک پر پڑیں گے اور چند سالوں میں ہی ملک کی ساری اعلیٰ ذمہ دار پوسٹوں پر یہی نظریاتی لوگ رسائی حاصل کر لیں گے۔ اس کے نتیجے میں دس پندرہ سال میں ہی ملک خداداد پاکستان کے تمام سرکاری افسران، فوج کے مقتدر حلقے، اعلیٰ عدلیہ صنعتوں کے ذمہ داروں اور اعلیٰ تاجر سب کے سب نظریاتی فوج کے طور پر روزمرہ معاملات کے میدان میں اسلام پر عمل پیرا ہوں گے اور ملک کی نظریاتی سطح پر بدی اور بدی کی مختلف شکلوں سے نبرد آزما نظر آئیں گے اس سے ملک کی نظریاتی اساس مضبوط ہوگی اور اس

کے استحکام میں اضافہ ہوگا۔

خوشحال اور ترقی یافتہ پاکستان

تعلیمی میدان میں ایسے نظریاتی نظام تعلیم سے فارغ التحصیل جب ملکی معاملات کی باگ دوڑ سنبھالیں گے اور قرآن مجید کے مردمومن، اقبال کے شاہین اور بیدار 'خودی' کے مالک بن کر عملی زندگی گزاریں گے تو یقیناً...... پاکستان سے

☆اقرباء پروری ☆ دھونس دھاندلی ☆ بدیانیتی ☆ رشوت ☆ وسائل کا ناجائز استعمال ☆اختیارات کا ناجائز استعمال ☆ کام چوری ☆ جھوٹ ☆ وسائل کا ضیاع اور...... ☆ کام کیے بغیر تنخواہ حاصل کرنے کی سوچ کی حوصلہ شکنی ہوگی اور جلد یا بدیر ان برائیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

ہمارے کاروبار سے ملاوٹ، دھوکہ، سٹہ، سود، جوا، کم تولنا، دونمبر سامان بیچنا وغیرہ کا خاتمہ ہو جائیگا۔

ہمارے تعلیمی اداروں سے ساری تعلیمی خرابیاں ختم ہو جائیں گے نقل کرانا، ٹیوشن، گیس پیپرز کا کاروبار، پیپر مارکنگ کے گھپلے، سفارشیں، طلباء اور اساتذہ کا کلاسوں میں نہ آنا، تعلیمی معیار کی گراوٹ جیسے ناسور ناپید ہو جائیں گے اور خوشگوار تعلیمی فضا چھا جائے گی۔

ہمارے کارخانے بازار، کاروباری ادارے، دیانتداری، وعدہ وفائی، مصنوعات کا اعلیٰ معیار، ناپ تول کے اعلیٰ معیار، صفائی، منافع خوری کی حرص اور ذخیرہ اندوزی جیسی برائیوں اور منکرات سے پاک ہو جائیں گے۔

ہمارا معاشرہ دولت کی حرص، دولت کی نمائش، رہائشوں پر بے تحاشا اخراجات، فضول خرچی، تصنع اور دیگر خرافات سے گلوخلاصی پالے گا اور...... یوں پاکستان میں...... کام میں عظمت، محنت کا شوق، دیانتداری، اخلاق، کردار، سچ، وعدہ وفائی، بے حیائی کاروباری اخلاق جیسی خوبیاں ابھر کر سامنے آجائیں گی اور ایسے لوگوں کی عزت افزائی ہوگی اور غیر اخلاقی سرگرمیوں کا سدباب ہو جائے گا۔ جس سے.................. یہ ملک پاکستان بہت جلد دنیا کے صف اوّل کے ترقی یافتہ ممالک میں شامل ہو کر اپنا اعلیٰ مقام حاصل کرلے گا اور دنیا پاکستان کی ترقی اور اہلیان پاکستان کے اخلاق و کردار سے متاثر ہو کر اسلام کی طرف مائل ہو جائے گی۔

اور یوں علامہ اقبال کا خواب پورا ہو جائے گا کہ پاکستان دور حاضر کی جدید اسلامی

جمہوری فلاحی ریاست بن جائے گا اور دیگر ممالک اس ملک میں امن وامان اور اخلاق و کردار کو رشک کی نگاہ سے دیکھیں گے اور مسلمان ہونے پر آمادہ ہو جائیں گے۔

نظریاتی نظام تعلیم اور ہمارے دینی مدارس

پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے اور اس کا نظریہ ''اسلام'' ہے۔ پاکستان میں نظریاتی نظام تعلیم و تربیت پر گفتگو کا مطلب اسلامی نظام تعلیم و تربیت ہی ہے۔ اسلامی نظام تعلیم کیا ہے؟ اس پر گفتگو کے دوران ایک منصف مزاج قاری کا ذہن لازمی طور پر ملک میں جاری دینی مدارس کے نظام کی طرف مبذول ہوگا۔ جو بدیہی طور پر قرآن وحدیث کی تعلیم کا ہی نظام ہے۔

یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ دینی مدارس کا یہ نظام اپنا ایک مقام رکھتا ہے اور اس کو علی حالہ جاری رہنا چاہئے۔ اس نظام کے ذمہ داران علماءِ حق ہیں ان کا ایک مطمع نظر ہے، عوامی عطیات وصدقات سے یہ نظام جاری ہے اور سخت ضابطوں سے بھی شاید ختم نہ ہو سکے۔

دینی مدارس کے اس نظام کے بارے میں علامہ اقبال نے جو بات کہی تھی اس پر کوئی اضافہ تا حال ہمارے لئے ممکن نہیں ہے (اور شاید ایک طویل عرصے تک کسی دانشور کے لئے بھی ممکن نہیں ہوگا) کہ دینی مدارس کے اس نظام کو علی حالہ (اس کمی بیشی کے ساتھ جو اس کے ذمہ داران خود کرنا چاہیں) چلنا چاہئے۔ علامہ اقبال نے فرمایا کہ مَیں اندلس (ہسپانیہ یا سپین) میں ہو کر آیا ہوں وہاں آٹھ صدیاں مسلمانوں نے حکومت کی (711ء سے 1492ء تک) مگر آج وہاں ایک مسلمان بھی نہیں، سقوط غرناطہ کے ساتھ ہی وہاں سے مسلمان اور اسلام معدوم ہو گئے، کیوں؟ وہاں عوامی سطح مسلمانوں میں دینی تعلیم کا کوئی نظام نہیں بن سکا تھا۔ یہ ادارے اور نظام تعلیم مسلمان اُمت کے اندر، خارجی حالات سے بے نیاز، بہار ہو کہ خزاں، مسلمان حکومت ہو یا انگریز کی غلامی کا دور، عوامی سطح پر شعائر دینی کی تعلیم اور قرآن وحدیث کے متون کی حفاظت و صیانت کے ذمہ دار ہیں حکومت پر کوئی بوجھ نہیں بنتے.....عوام میں اپنی مضبوط جڑیں رکھتے ہیں اور انہیں کے عطیات وصدقات سے جاری ہیں۔

دنیا میں عروج و زوال تو ہر قوم پر آتا رہتا ہے آج حکومت ہے کل نہیں ہے سرکاری و

حکومتی ادارے اور نظام تعلیم مسلمانوں کے غلبہ اور حکومت کے مرہونِ منت ہوں گے جبکہ یہ ادارے اور نظام تعلیم .....مسلمانوں کے عروج وزوال سے قطع نظر مسلمان عوام میں دینی شعائر کی تعلیم کے ذریعے دینی شعائر کو زندہ رکھنے کا باعث ہیں۔

اس شمارے میں نظریاتی نظام تعلیم کی ساری گفتگو.....ریاست اور حکومت کی سطح پر..... پاکستان کی نظریاتی ریاست کو حکومت اور ملک چلانے کے لئے نظریاتی لوگوں کی کھیپ (LOT) ایک تسلسل کے ساتھ فراہم کرنے کے لئے نظریاتی سکولوں کالجوں فنی اداروں اور محکمانہ تربیتی اکیڈیمز کے ایک ملک گیر جال کی فراہمی کی اہمیت ضرورت وافادیت کا شعور اجاگر کرنے کیلئے ہے۔

پاکستان اور نظریاتی نظام تعلیم

ایسا نظام تعلیم صرف پاکستان جیسے نظریاتی ملک ہی کی ضرورت ہوسکتا ہے اور اس کی کوئی مثال یقیناً تمام عالم میں پہلے سے نہیں مل سکتی۔ پہلے سے تیار (READYMADE) یا ضرورت کے مطابق (CUT TO SIZE) قسم کی اصلاحات کے لئے دوسرے شعبے از قسم زراعت، تجارت اور صنعت وغیرہ ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ واحد شعبہ جس میں ہمیں خود آگے بڑھ کر اپنے لئے راستہ تلاش کرنا ہوگا۔ اسلامی دنیا کا واحد نظریاتی ملک پاکستان ہے جس کا نظام تعلیم بھی نظریاتی ہی ہونا ضروری ہے جس کو اُصولی طور پر ہمارے نظام تعلیم میں تعلیمی پالیسی کے طور پر اگرچہ بہت پہلے تسلیم کرلیا گیا تھا جو یہ ہے:

OBJECTIVES OF HIGHER EDUCATION

(As outlined in the National Education policy)

1. To inculcate islamic ideology, moral values and preservation of our religious and cultural heritage.
2. To equip individuals with the latest knowledge and technology.
3. To provide sufficient base of scientific knowledge and develop capabllities of individuals so that they are able to play their role effectively in society.
4. To promote intellectual faculties and develop capebllities of individuals so that they are able to play their role effectively in society.
5. To produce highly educated and technically skilled manpower in sufficient number as requlred by society.
6. To increase access to higher education by providing places and to advance learning and generate knowledge. (DAWN LAHORE, SUNDAY, MAY 14,2006 PAGE 25)

مگر عملاً اس پر عملدآمد اور اس کے FOLLOW UP اور مزید پیش رفت کے لئے مسلسل نگرانی کے مراحل سرے سے آئے ہی نہیں اس لئے کہ ہم نے اس سمت میں سفر کا آغاز ہی نہیں کیا ہمارے ماہرین تعلیم مغرب کی سیکولر ترقی کی تیز رفتاری سے اڑتی دھول ہی میں حیران پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ ع ''بوعلی اندر غبار ناقہ گم'' جبکہ علامہ اقبال نے اپنے مرشد روم کی طرح! ع ''دست رومی پردۂ محمل گرفت'' کے مصداق بہت پہلے مغربی نظام کی جزئیات کو سمجھ کر اس کا علاج بھی تجویز کر دیا تھا۔

پاکستان اور نظریاتی نظام تعلیم

اس وقت ضروری ہے کہ پاکستان میں نظریاتی اثاثہ کے تحفظ کے لئے ایک نئے نظام تعلیم کی ضرورت کو محسوس کیا جائے جس میں پرورش پا کر اور پروان چڑھ کر ہمارے فارغ التحصیل نوجوان (PASSING OUT YOUTHS) اقبال کے مردمومن اور شاہین ہوں اور اسلام کے سپاہی ہوں۔ اسلام کے دور حاضر میں نمائندے ہوں اور قرآن و حدیث اور فروغ اسلام میں محکم اساسات کے سہارے کھڑے ہوں۔ اس نظریاتی تعلیمی نظام کے لئے سوچنا اور اس کے خدوخال وضع کرنا بھی ایک اہم مرحلہ ہے۔ اور ان محکم اساسات پر ایک یونیورسٹی کی تشکیل کرنا دوسرا مرحلہ ہے۔ جس کے تمام تعلیمی شعبے توحید، رسالت اور جہاد کے اُصولوں پر استوار ہوں اور قرآن وسنت اور عقل وفکر کی جملہ صلاحیتوں کو ان کا اپنا حق دے سکیں تیسرے مرحلے میں ہر ضلع میں کم از کم ایک ہائی سکول اس نظام کے لئے مختص کیا جائے اور صوبے میں اندازاً ایک کروڑ آبادی پر ایک پوسٹ گریجویٹ کالج اس یونیورسٹی سے منسلک کیا جائے۔ اس پرائمری سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری لیول کے بعد گریجویٹ کی سطح کے جو جوان اس یونیورسٹی سے ملحق ہوں گے اور اس کے تعلیمی ماحول میں پروان چڑھیں گے وہ اس نظام تعلیم کا حاصل ہوں گے اور اُمید ہے کہ پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے محافظ اور اسلام کی چودہ صدسالہ روایات کے امین ہوں گے۔

اس قسم کے نظام تعلیم کے لئے اساتذہ بھی شاید پہلے سے بنے بنائے نہ مل سکیں انہیں خصوصی شارٹ کورسز (SHORT COURSES) سے گزارنا ہوگا اور ذہن سازی کرنا ہوگی تاکہ وہ منفرد قسم کے ایک اعلیٰ نظام تعلیم کے ہراول دستہ بننے کے اہل ثابت ہوسکیں۔ اس نظام تعلیم میں نصاب تعلیم کا مرحلہ سب سے زیادہ کٹھن ہے اس لئے کہ آج کی دنیا میں اگرچہ علم نے بے حد ترقی کر لی اور کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے ذریعے عام انسانوں کی دسترس میں بھی دنیا بھر کا علمی ورثہ موجود ہے مگر اس ورثے سے استفادہ سے پہلے ایک نظریاتی مسلمان کے ذہن کا جو تانا بانا اور تحقیقی سائنسی اور متوازن فکری مزاج ناگزیر ہے۔ وہ ''ظرف انسانی'' بنانا اصل مرحلہ ہے۔ یہ ذہن ایک دفعہ بن جائے تو اس انسان کی سوچ صراط مستقیم پر ہوگی اور اس پر اعتبار کر کے آزاد چھوڑا جا سکے گا کہ وہ آئندہ زندگی میں جو بھی عقلی وفکری نتائج اخذ کرے گا وہ ''راہ حق'' اور ''سچ کی راہ'' یا صراط مستقیم سے زیادہ بعید نہیں ہوں گے۔ گویا مستقبل کے اسلامی تعلیمی نظام کے لئے پرائمری سے لے کر یونیورسٹی لیول تک اس مجوزہ یونیورسٹی کو اپنا نصاب تعلیم خود تجویز کرنا ہوگا۔ اس طرح کے منصوبہ سے ملتی جلتی کئی مثالیں ماضی قریب کے دور میں ڈھونڈی جا سکتی ہیں۔

نظریاتی نظام تعلیم — تجرباتی وعمرانی علوم اور علم وحی کا اشتراک یا

CO-EDUCATION

علم بالحواس اور علم بالعقل وہ علم ایسا ہے کہ انسان کو بحیثیت انسان عطا فرمایا گیا ہے اور اس میں مسلم یا غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں جو محنت کرے گا پالے گا اور اپنے نظریات ترتیب دے کر دنیاوی ترقی کرے گا اور دنیا میں اپنی تہذیب وتمدن کا ڈنکہ بجائے گا۔قرآن مجید میں حضرتِ انسان کی رہنمائی کے لئے ایک دوسرے علم کا بھی تذکرہ ہے وہ علم_______ علم بالقلب ہے اور اس علم کی تفصیل، اس کی شاخیں، اس کی حفاظت واشاعت کے معاملات' انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے تربیت یافتہ اصحاب رضی اللہ عنہم کے ساتھ منسلک ہیں۔عصر حاضر میں علم بالحواس اور عقل کی مادر پدر آزادروش کے باعث اس کی تباہ کاریاں ہمارے سامنے ہیں کہ انسان حیوان ہی نہیں درندہ بن چکا ہے اور ابھی درندگی میں مسابقت کی دوڑ جاری ہے۔اس علم کو مادر پدر آزادی کی روش سے ہٹا کر علم بالقلب کے ساتھ جوڑنے کی ضرورت ہے جس سے انسان میں اخلاق، کردار، عفت، عصمت، شرافت، امانت، دیانت، شجاعت جیسے اوصاف پیدا ہوں گے۔یہ کام اتنا بڑا کام ہے کہ اسے امام غزالی رحمہ اللہ علیہ کے احیاء العلوم کی تحریک اور مغربی تجدید علوم کی ملحدانہ تحریک کے بعد اب تاریخ انسانی کی تیسری علمی تحریک کا نام دیا جا سکتا ہے۔

انسانی علم کی موجودہ مشترکہ متاع کا تنقیدی جائزہ لے کر اس میں سے یونانی فلسفہ اور رومی ظلم وجبر کے اُصول نکال دیے جائیں اور اس کی جگہ علم وحی، سیرتِ انبیاء ورسل علیہم السلام حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا انداز حکمرانی اور خلافت راشدہ جو علوم انبیاء علیہم السلام کی وارث بنی' کے قانون اور انداز حکمرانی کو داخل کر دیا جائے یہ موضوع بذات خود طوالت اور تفصیل کا متقاضی ہے لیکن مختصراً اسے تجرباتی وعمرانی علوم اور علم وحی کا اشتراک یا CO-EDUCATION کہا جا سکتا ہے۔

نظریاتی جماعتوں کے دوام حیات کا راز

نظریاتی نسل بڑھانے کا تقاضا جی بھر کے اپنے ارمان جب نکالتا ہے کہ آدمی کو اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت درپیش ہوتی ہے، وہ اب ان کے ساتھ وہی معلّمانہ عمل دہراتا ہے جو بچپن میں اس کے ماں باپ نے اس کے ساتھ شروع کیا تھا اور سمجھایا تھا کہ کس بات کا ماننا اور کس کام کا کرنا صحیح ہے اور کس کا غلط، وہ گویا اپنے بچوں کے اندر اسی تخم یا جرثومے کو از سر نو تخلیق کر دیتا ہے جس سے اپنی نظریاتی شخصیت اُگی تھی۔ یہ بیج بچوں میں اس کی تعلیمی توجہ اور خبر گیری کے زیر سایہ اسی طرح کونپل دیتا اور پروان چڑھتا رہتا ہے جس طرح سابق میں خود اس کے ماں باپ کی توجہ اور خبر گیری کے زیر سایہ اس کے اندر پروان چڑھا تھا۔ بڑے لوگوں کی طرف سے یہ کوشش کہ نئی نسل کو اپنے نظریاتی مسلک کا شیدائی بنایا جائے، ساری قوم مجموعی حیثیت سے جاری رکھتی ہے اور اس کی بدولت اس نظریاتی جماعت کو حیات دوام مل جاتی ہے۔ اسی کوشش کا نام تعلیم ہے اس کے سوا کچھ نہیں، اسی لئے تعلیم کی تعریف کی جائے تو یہ ہوگی کہ تعلیم وہ طریقہ کار ہے جس سے کسی جماعت کے پختہ عمل لوگ نئی نسل کے افراد میں یہ جذبہ پیدا کرتے ہیں کہ مشترکہ نظریاتی مسلک کی بقدرِ امکان زیادہ سے زیادہ محبت اور خدمت کریں۔ مسلک کے حسب اقتضا تمام ضروری علوم و فنون حاصل کرلیں اور تمام ضروری ہنرمندیوں، عادتوں، رویوں، رجحانوں، خواہشوں، دلچسپیوں، خیالوں، محبتوں، کراہتوں، رغبتوں، نفرتوں، امیدوں، امنگوں، اغراض و مقاصد، اخلاق و تہذیب، زاویہ ہائے نظر و آراء، عقائد و معیاراتِ خوب و ناخوب کے حامل بن جائیں۔

غیروں کی تعلیم سے قوم کے نظریاتی وجود کا فنا ہونا

جس حد تک نظریاتی مسلک والی کوئی قوم دوسری قوم کی تبلیغ سے متاثر ہوجاتی ہے، اسی حد تک اس کا اپنا وجود معدوم ہوجاتا ہے، بلکہ اس میں ضعف پیدا ہوجاتا ہے اور وہ اس کا مزید اثر قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوجاتی ہے۔ رفتہ رفتہ بیرونی تعلیم کا مواد اندرونی نظام تعلیم میں راہ پاجاتا ہے اور وہ روز بروز اپنا نفوذ بڑھاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ سرتاپا چھا جاتا ہے۔ اس سے سمجھنا چاہیے کہ عملاً قوم کا ذہنی ارتداد مکمل ہوگیا اور اس نے غیر مسلک کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ کسی

قوم کا نظریاتی وجود ختم ہوجانا، علامت ہے کہ سیاسی وجود پہلے ہی مٹ چکا ہے یا جلد ہی مٹنے والا ہے۔کوئی نظریاتی قوم اگر چاہے کہ جو ہے وہی رہے اور اپنا وجود فنا نہ ہونے دے تو اس کو اسی پر بس نہ کرنا چاہیے کہ گھر کے اندر جو نظام تعلیم جاری ہے، وہ اٹھتی ہوئی نسل میں جماعت کے نظریاتی مسلک کے ساتھ محبت پیدا کرنے کا ضامن ہو بلکہ یہ فکر بھی رکھنی چاہیے کہ کسی غیر جماعت یا جماعتوں کے نظریات اس محبت میں تخفیف یا نقص پیدا نہ کرنے پائیں۔ بدن کی صحت تقاضا کرتی ہے کہ بدن کو تمام بیماریوں کے مہلک جراثیم سے محفوظ و مامون رکھا جائے، اسی طرح نفسیاتی ارتقا چاہتی ہے کہ تمام اجنبی تصورات کے مضر اثرات سے نفس کو محفوظ و مامون رکھا جائے۔

نظریاتی جماعت میں نظام تعلیم کے ذریعہ تصرفات کا تقسیم ہونا اور نظام تعلیم کو ناکارہ بنا کر قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالنا

عضوی جسم کی زندگی پر ایک تقاضا مسلط رہتا ہے وہ یہ کہ اس کی عضوی زندگی کو قالب نصیب ہو۔نظریاتی جماعت کی زندگی پر جس تقاضے کا تسلط رہتا ہے وہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے مسلک کی محبت قائم رہے۔جسم کے اندر ایک عضو ہوتا ہے جس کو دل کہتے ہیں۔زندگی کا مرکز یہی ہے، یہیں سے دوسرے اعضا کو سیالِ حیات تقسیم ہوتا ہے جس سے ان کی پرورش ہوتی ہے۔اسی طرح نظریاتی جماعت میں ایک نظام ہوتا ہے یعنی جماعت کا نظامِ تعلیم۔یہی محبت کا مرکز ہے، یہیں سے تصورات تقسیم ہوتے ہیں جو افراد کے دلوں میں مسلک کی محبت کو غذا پہنچاتے ہیں۔جس طرح کوئی جانور دوسرے ذی حیات کا مرکز حیات ناکارہ کردے تو اس کو ہلاک کرسکتا ہے اسی طرح ایک نظریاتی جماعت دوسری کو اس کا نظام تعلیم ناکارہ بنا کر صفحۂ ہستی سے مٹا سکتی ہے۔مثال یہ ہے کہ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد جب جاپان، جرمنی اور اطالیہ پر فاتح فریق کا فیصلہ ہوگیا تو نازی، میکادوی اور فسطائی نظریات کو موت کی نیند سلا دینے کے لئے ان ممالک کے تعلیمی نظام بلا توقف برباد کردیے گئے۔

ڈاکٹر رفیع الدین کے تعلیمی نظریات کا خلاصہ ''قومی تعمیر وزوال میں نظام تعلیم کا کردار'' حافظ محمد موسیٰ بھٹو

انتساب

اُن سچے مسلمان پاکستانی شہریوں کے نام
جو نظریۂ پاکستان پر غیر متزلزل یقین رکھتے ہیں اور مسلمانانِ ہند
کی دوقومی نظریۂ کے تحت علیحدہ حاصل کیے گئے ملک پاکستان کی تعمیر و ترقی کے خواہاں ہیں
کہ وہ نظریۂ پاکستان کی آبیاری کے لیے ملک پاکستان کے نظام تعلیم کو
نظریاتی نظام تعلیم میں بدلنے کی جدوجہد کریں تاکہ اسے سیکولر ہونے سے بچا سکیں
اور اس طرح پاکستان کی بقاء اور استحکام کو یقینی بنائیں
پاکستان میں نظریاتی نظام تعلیم کے اجراء سے ہمارے کالجوں یونیورسٹیوں سے
فارغ ہونے والے لاکھوں نوجوان اس جذبے سے سرشار ہوں
کہ پہلے پاکستان اور پھر عالمی سطح پر
موجودہ سائنسی ترقی اور جدید سہولتوں کے ساتھ ساتھ
شرم وحیا، عفت وعصمت
اللہ اور رسول ﷺ کے احکام کے اندر آزادی
عدل وانصاف، مساوات، عدل اجتماعی، حاکمیت خداوندی
اور کفالت عامہ کے تصورات کو حقیقی جامہ پہنانے کے لیے
اپنی زندگیاں وقف کر سکیں

اطلاع

قارئین حکمت بالغہ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ کاغذ کی گرانی اور دیگر عوامل کی وجہ سے دسمبر 10ء سے پرچے کی قیمت میں اضافہ کیا جارہا ہے۔ فی پرچہ -/35روپے، سالانہ خریداری -/350روپے اور تاحیات اجراء -/15000روپے۔ اس خصوصی شمارے کی قیمت-/70روپے فی شمارہ ہے۔ (ادارہ)

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیرِ پاک ، خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

حدیث کا جائزہ

حیات طیبہ سے لے کر امام بخاریؒ تک 250 سال کے عرصے میں احادیث کی حفاظت پر ہونے والے کام کا تاریخی جائزہ لینے والی کتاب ''حدیث کا جائزہ'' کا خلاصہ تقریباً ایک ایک گھنٹے کے چار لیکچرز میں بیان کیا گیا ہے۔ان لیکچرز کی چار CDs دستیاب ہیں اور ایک DVD میں بھی دستیاب ہے۔اسکولوں، کالجوں اور مساجد میں بڑی سکرین پر یہ لیکچرز طلباء و طالبات اور نمازیوں کو دکھانے کا انتظام کر کے بیک وقت بہت سے لوگوں کے ذہنوں سے احادیث کے متعلق شکوک وشبہات دور کیے جاسکتے ہیں۔ دین کی خدمت کا جذبہ رکھنے والے اصحاب سے اس کام کی طرف توجہ کرنے کی درخواست ہے۔ چار CDs کی قیمت-/120روپے اور ایک DVD کی قیمت-/60روپے ہے۔ڈاک خرچ فاؤنڈیشن ادا کرے گی۔ DVDs/CDs کی قیمت ڈاک کی شکل میں ارسال کی جاسکتی ہے۔ یہ لیکچرز ویب سائٹ پر بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

www.asanasbaq.com

البلاغ فاؤنڈیشن — A-43 نثار روڈ لاہور کینٹ

اسلامی خط وکتابت کورسز کا ادارہ — فون: 0333-4620717,0321-4090779

ای میل: albilagfoundation@yahoo.com